بہترین سفرنامے

قدرت اللہ شہاب ○ اشفاق احمد ○ ابن انشا ○ ڈاکٹر محمد اجمل ○ قرۃ العین حیدر

سلسلۂ مطبوعات
۲

قیمت
۳/- روپے

انتخاب

حرفِ اوّل

لیجیے ـــــ ہماری دوسری کتاب "اُردو کے بہترین سفرنامے" حاضرِ خدمت ہے۔ ہماری پہلی پیشکش "امراؤ جان ادا" کو آپ نے جس گرمجوشی سے قبول کیا اور ہماری جو حوصلہ افزائی فرمائی اس نے ہمیں کام کرنے اور اردو ادب کی خدمت کا نیا جوش اور ولولہ عطا کیا ہے۔

ہماری کتابوں کے سائز، کتابت و طباعت، سرورق اور گٹ اپ کے ضمن میں ہمیں آپ کی جانب سے جو تعریفی خطوط ملے ہیں، ان سے پتا چلتا ہے کہ پورے ملک کے قارئین کو انتخاب پبلی کیشنز کا یہ تجربہ بے حد پسند آیا ہے۔ اس سلسلے میں ہم آپ کے سپاس گزار ہیں۔

ہماری یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اردو ادب کے ان درخشندہ اور لازوال اہلِ قلم کے سفرناموں اور رپورتاژوں پر مشتمل ہے جنھوں نے تخلیق اور تحریر کے میدان میں اپنی عظمتوں کے علم گاڑے ہیں۔

اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب، ابن انشا، ڈاکٹر محمد اجمل اور قرۃ العین حیدر آپ کے جانے پہچانے نام ہیں۔ ان کے یہ سفرنامے بکھرے ہوئے تھے جو ہم نے سمیٹ کر آپ کے لیے یکجا کر دیے ہیں۔

ان تخلیقات کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ یہ تو وہ تحریریں ہیں جو زندۂ جاوید ہیں ـــ یہ وہ مصنفین ہیں جو اپنی زندگی ہی میں امر ہو گئے ہیں۔ اعلیٰ تحریروں اور بے مثل تخلیقات کا یہ گلدستہ بصد عجز آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔

ہمیں لکھیے گا، انتخاب کا یہ "انتخاب" آپ کو کیسا لگا؟

فقط

ناشر

اعلیٰ کتابیں • سستی کتابیں

- ہم دنیا بھر کا اعلیٰ ادب انتہائی کم قیمت پر پیش کرتے ہیں۔
- ہم دنیا کے ہر موضوع پر بیش قیمت کتابیں شائع کرتے ہیں۔
- ہماری کتابیں کتابت، طباعت، گٹ اپ اور معیار کے اعتبار سے بے مثل ہیں۔
- ہمیں برِ صغیر کے اعلیٰ درجے کے سبھی مصنفین کا تعاون حاصل ہے۔

اچھی کتابیں ـ سستی کتابیں

اعلیٰ کتابیں انتہائی سستی قیمت پر

ہماری پہلی پیشکش اردو عظیم ناول

امراؤ جان ادا

مصوّر ایڈیشن

قیمت -/۴

اپنے شہر کے ایجنٹ، ہاکر یا بک سیلر سے حاصل کیجیے

ـــ یا براہِ راست ہم سے طلب فرمائیے

انتخاب پبلی کیشنز • مسلم ٹاؤن لاہور

یہ کتاب ـــ

اُردو کے بہترین سفرنامے

مصنفین: اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب، ابن انشا، ڈاکٹر محمد اجمل، قرۃ العین حیدر۔

ناشر: مریم ذوالفقار

تاریخِ اشاعت: مارچ ۱۹۷۶ء

مطبع: ذوالفقار اینڈ کو

قیمت: -/۳ روپے

احمد

اُردو کے

بہترین سفر نامے

(مصوّر ایڈیشن)

Sadar gan ... 008

اشفاق احمد
قدرت اللہ شہاب
ابنِ انشا
ڈاکٹر محمد اجمل
قرۃ العین حیدر

اردو محل
پاپوش نگر کراچی

انتخاب
پبلی کیشنز مسلم ٹاؤن لاہور

فہرست

عرشِ منور	اشفاق احمد	۳
تو ابھی رہگذر میں ہے	قدرت اللہ شہاب	۲۴
ایک شام ماضی کے محرابوں میں	ابن انشا	۳۳
چند روز فرانس میں	ڈاکٹر محمد اجمل	۴۵
دکھلایئے لیجا کے تجھے مصر کا بازار	قرۃ العین حیدر	۵۴

سرورق و تزئین : ذوالفقار تابش

GOVT. URDU LIBRARY
ACC.No. 13928
Date 28/7/..
PATNA

Govt. Urdu Library
13928

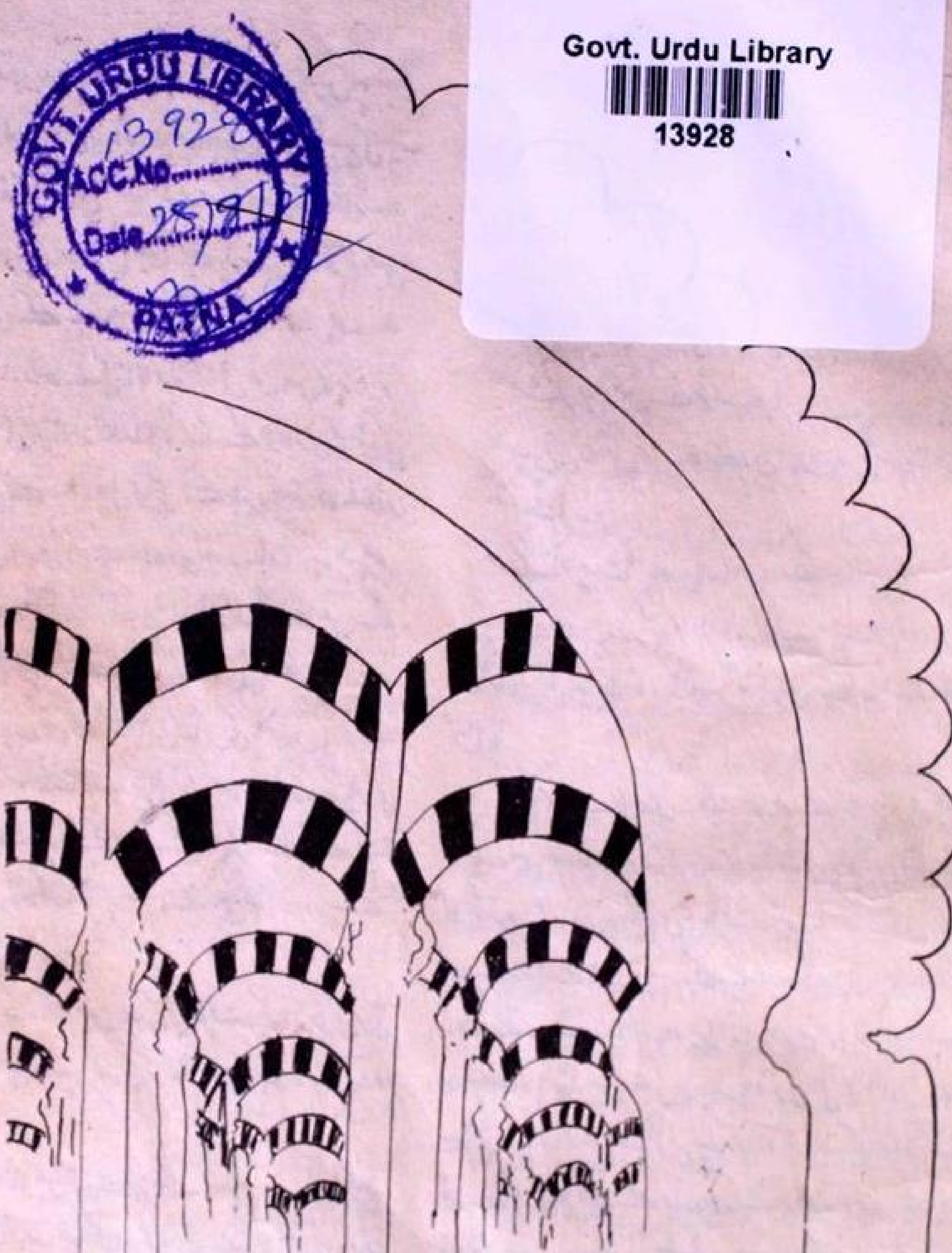

عکس مستور

اشفاق احمد

دونوں موٹی عورتیں مزے سے خراٹے لے رہی تھیں کپوسین پادری نے ایک آنکھ کھول کر میری طرف دیکھا اور اپنی وزنی تسبیح کی صلیب پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "سردی"۔ میں نے مسکرا کر سر کے اشارے سے جواب دیا "بڑی مزیدار ٹھنڈی ہوا ہے پادری جی۔ تم پردیسی ہو تم کیا جانو نسیم سحری کسے کہتے ہیں"۔ پادری نے آنکھیں موندے ایک لمبی سی جمائی لی اور سونے کی ناکام کوشش میں اس کا نرخرہ "چک چک پوندے" کی سی آواز نکالتا چھوٹے سے فولادی پسٹن کی طرح اوپر نیچے تیزی سے چلا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ تمناؤں کی بستی میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ وہ دن جب یاد آتے ہیں کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ انجن نے دہکتا ہوا ایک بڑا سا کوئلہ اگلا اور میں نے سر اندر کر لیا۔ جوان موٹی عورت نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے کنگھی بنا کر سوتے میں یوں تن کر انگڑائی لی کہ اُس کی باہنوں کی محراب اُوپر سامان رکھنے والے تختے تک پہنچ گئی۔ سوئے ہوئے پادری کی ٹانگ ہلنے لگی۔ بوٹ تیرا چھکے وے۔ رومال تیرا ہچکے وے۔ رومال تیرا ہچکے وے۔ دل کے کھوٹے کپوسین نے اپنی پوشاک درست کرتے ہوئے کہا "کھڑکی بند کر دیں!"

میں نے بیچارگی کے عالم میں کھڑکی کی طرف دیکھا تو جوان موٹی عورت نے کالی بھونرا سی آنکھیں کھول کر کہا "کھڑکی بند نہ کرنا۔ پردہ البتہ کھینچ لو۔"

میں نے تعمیل ارشاد میں گہرے سبز رنگ کا موم جامہ فوراً کھینچ کر عورت کی طرف مسکرا کے دیکھا مگر وہ خراٹے لے رہی تھی اور پادری خارپشت کی سی تھوتھنی نکالے چوں چوں بوٹ چونچا رہا تھا۔

ہوا کی تیزی سے موم جامے کی لمبائی کے اضلاع کمان سی بنے ہوئے تھے اور ان کے بطن خم سے میرے وطن کی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ چھوٹا سا ڈبہ، مدھم سا بلب، آٹھ سواریاں۔ طول جمع عرض ضرب دو ضرب بلندی۔ ٹھنڈی ہوا کتنی زیادہ تھی، کیسی بھرپور تھی۔ کس قدر روح پرور! کمان کے خم سے ایک اور دہکتا ہوا کوئلہ نظر آیا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا..... سوچنے لگا.... کہ...

پلیٹ فارم پر کوئی سبز بتی ہوا میں لہرا رہا تھا۔ کورڈوبا! کورڈوبا!

میں ہڑبڑا کر اُٹھا۔ اٹیچی بکس سنبھالا، تھیلا بغل میں دبایا اور دروازے کی طرف لپکا۔

"خوش وقتی! خوش بختی!" موٹی مائی نے کہا۔

"شکریہ" میں نے جواب دیا۔

"چین کی راتیں مزے کے دن" جوان موٹی عورت نے کہا۔

"شکریہ!"

"نیک نصیحت" پادری صاحب نے دعا دی۔

پھر دعاؤں اور شبھ کامناؤں کا ایک سلسلہ چل نکلا اور میں تیزی سے شکریہ شکریہ پکارتا۔ ٹرنک گھٹڑیاں پھلانگتا پلیٹ فارم پر اُتر آیا۔

صبح کاذب کا سماں۔ مٹیالے پلیٹ فارم پر کوئی پچیس واٹ کا ایک ہی بلب۔ اور کتابوں کے بند سٹال پر ٹانگیں لٹکائے سٹیشن کا مختصر سا عملہ ان دو قلیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جنہوں نے اِدھر اُدھر سے میرے بازو تھام رکھے تھے اور مجھے اپنی اپنی طرف گھسیٹ رہے تھے اور تیسرا آرام سے میرا اٹیچی اور تھیلا ہاتھ میں لٹکائے بڑی دور چلا جا رہا تھا۔ میں انہیں سر اور ہاتھوں حتیٰ کہ ٹانگوں کے اشاروں سے سمجھا رہا تھا کہ میں ہسپانوی نہیں جانتا مگر وہ مجھے کشاں کشاں اس تیسرے قلی کی طرف لئے جا رہے تھے جو اب نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ جب وہ دونوں سے نیور! نیور! کے نعرے لگاتے گرم گفتاری پر اُتر آئے۔ تو میرے بازوؤں نے ان کی گرفت کو قدرے نرم پایا۔ پیشتر اس کے کہ میں خود ہمت کرتا وہ ہاتھا پائی پر اُتر آئے اور میرے بازو چھوڑ دیے۔ موقع غنیمت جان کر میں تیسرے کے پیچھے بھاگا اور اس سے جا کر وہ تھیلا لے لیا جس میں پاسپورٹ اور سرکار ہسپانیہ کے چند نہایت ہی اہم حکم نامے تھے۔

قلی کے مشورے سے بابو صاحب کو ایک پسیتا منتانہ دے کر

اٹیچی کیس کلوک روم میں رکھوایا اور خود سٹیشن کے عین سامنے گراسی پلاٹ سے گزر کر اس اکلوتے ریستوران میں جا بیٹھا جس کی بتیاں روشن تھیں۔

یہ کچھ ایسا شیشوں، آئینوں اور رنگ برنگی تصویروں والا ریستوران نہ تھا جیسے گوالمنڈی یا بھاٹی دروازے کے باہر موجود ہیں۔ بلکہ ایک وسیع دالان تھا جس کے ایک کونے میں چپس کا کاؤنٹر تھا دوسرے میں لکڑی کے تین کیبن اور باقی کے کشادہ فرش پر لکڑی کی گول اور چوکور تپائیاں اور ٹین کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک تپائی کے گرد پانچ چھ مزدور جمع تھے اور چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک موسیقار گٹار پر دھنیں بجا رہا تھا کونے سے ایک کرسی کھینچ کر میں اس گول تپائی کے قریب بیٹھ گیا جس پر دودھ کافی اور چینی کی گاڑھی سی تہہ چڑھی ہوئی تھی اور اس میں کل شام کی دو صحت مند مکھیوں کی لاشیں پھنسی ہوئی تھیں۔ میں نے شرلک ہومز کی طرح اس تپائی کا جائزہ لیا ۔ ایک شرابی قلی اس پر کافی پی کر گیا تھا ۔ باہر گراسی پلاٹ کے پیچھے قرطبہ کا سٹیشن صبح کاذب کی ناکافی روشنی میں فلمی ڈونزولو سے برآمد ہو رہا تھا ۔ مجھے یوں لگا جیسے میں واپس گاؤں پہنچ گیا ہوں۔ چھوٹی پٹڑی کی گاڑی کا مختصر سا سٹیشن شیشم کے پیڑوں میں چھپا ہوا میری طرف جھانک رہا ہے۔ کمیٹی کے نل کے پاس مرونڈے خطائیاں بیچنے والا بڈھا اپنے سودے کو بھڑوں کی پنکھی جھل رہا ہے اور ٹھنڈے سوڈا واٹر کا مریل لڑکا پھٹی ہوئی نیکر پہنے گولی والی بوتلوں کو بھورے رنگ کے گنجے برش سے دھو رہا ہے۔ سٹیشن کے پچھواڑے روئی کی گانٹھیں باندھنے والے پریس سے بہت دور نہر کا بنگلہ ہے جہاں گراموفون کی طرح چابی گھمانے والا ٹیلیفون لگا ہے، برآمدے میں سفید پگڑیاں باندھے پنسال نویس اپنے رجسٹر بھر رہے ہیں اور نہر کے اس پار قصبے کا قبرستان ہے جس میں میرا دادا دفن ہے۔ میرا پڑدادا عالمگیر کی شاہی فوج میں ایک معمولی سپاہی تھا جس نے پیرانہ سالی کے باوجود تلوار چلانے اور روکنے میں وقت کے چھ جوانوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ پنج وقتہ نمازی جو زرہ پہنے اور ہتھیار سجائے دن بھر باوضو رہتا، آدھی رات کے بعد کمر بند کھول کر تہجد گزاری میں مشغول ہو جاتا۔ اس سپاہی کے گھر اس سرہنگ زادے نے جنم لیا جو تنومند، دراز قد اور قوی الجثہ ہونے کے باوجود ایک عاشق کا دل لے کر آیا۔ جب میر تقی اپنے بیٹے کو خلوت میں عشق کرنے کی تلقین کر رہے تھے اس سرہنگ زادہ نے ان کی گفتگو سن لی تھی اور تیغ و سناں کو علم و دانش کی محبوبہ کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔ ایک دن جب بیٹے سے بائیں پاؤں پر گھوم کر والد کا وار روکا نہ جا سکا تو پڑدادا نے ٹھنڈی سانس بھر کر اس ناخلف کو مکتب کے حوالے کر دیا۔ پندرہ سولہ برس بعد جب باپ کو اپنی قوت بازو اور پامردی پر بھروسہ نہ رہا تو اس نے بیٹے کے لیے ایک مناسب بر ڈھونڈا اور ہتھیلی کھول کر شادی کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ جب حسن پرست اور صاحب جمال بیٹے کو اپنی اس نسبت کا علم ہوا تو وہ شادی سے اس لئے منحرف ہو گیا کہ زشت رو رفیق سے غربت کے خارزاروں میں عمر بھر اکیلے بھٹکنا کہیں بہتر ہے۔ سپاہ عالمگیر کے معرکہ آرا بڈھے سپاہی نے بیٹے کو سمجھانے کی غرض سے ساتھ لیا اور قصبے سے دور کھیتوں میں نکل گیا گھر بسانے اور کنیت کا تصور زندہ رکھنے کے لیے پیر مرد نے جتنی بھی درخواستیں بیٹے کے حضور میں گزاریں رشد اور غزالی کے قاری نے انہیں براہین و دلائل سے باطل کر دیا۔ ببول کے جھنڈ میں خار مغیلاں کے جانکاہ بستر پر تجربہ کار بڈھے سپاہی نے مکتب کے شوخ طفل کو ایک ہی داؤ میں آہو بچے کی طرح گرا لیا اور اس کی چھاتی پر سوار ہو گیا۔ زنگ آلود پیش قبض پہلو سے نکال کر اس کے حلقوم پر رکھ دیا اور گرج کر پوچھا "بول شادی کرے گا یا نہیں"۔ اس نے سر ہلا کر اقرار کیا۔ ایجاب و قبول کا سلسلہ چلا اور میری دادی عالمگیر فوج کے رزم آرا بڈھے سپاہی کی بہو بن کر اس کے گھر آ گئی۔ کوئی چھ مہینے تک دادا اپنے باپ اور بیوی کے ساتھ ہمارے آبائی گھر میں رہے اس کے بعد الازہر کی مطبوعہ کتابوں کا ایک ڈھیر گھر پر چھوڑ کر دکن بھاگ گئے۔ جن دنوں وہاں ڈپٹی نذیر احمد حفظ کلام پاک میں مصروف تھے دادا جان ہائی کورٹ میں وکالت کا امتحان پاس کر رہے تھے۔ گو میرے والد اور میری دادی کو خرچ برابر پہنچ رہا تھا مگر اس بات کی توقع گاؤں بھر میں کسی کو بھی نہ تھی کہ وکیل صاحب کبھی خود بھی گھر پہنچ جائیں گے۔

دکن میں موسی ندی کی طغیانی سے جہاں اس قدر نقصان ہوا وہاں بس ایک ہی فائدہ نہیں ہوا کہ گلشن بہار کا مسودہ منظر عام پر آ گیا بلکہ یہ بھی ہوا کہ ہمارے دادا فالج کے مرض میں مبتلا ہو کر محض اس لیے

واپس گاؤں آنے پر مجبور ہو گئے کہ ان کا اکلوتا بیٹا خود چل کر انہیں لینے آیا تھا۔

ہم سب بھائی اپنے دادا کی قبر پر پودے لگانے جاتے۔ اور نہر سے کنستر بھر بھر کر ان کی قبر پر پانی چھڑکتے تھے۔ پھر ہمارا ایک چھوٹا بھائی مر گیا تو ہم نے اس کی قبر دادا کے پہلو میں بنوائی اور اس کے سرہانے گیندے کا ایک پودا لگایا۔ جب تک ہم چھوٹے تھے اپنے دادا کی قبر پر اکثر جایا کرتے جب ذرا بڑے ہوئے تو یہ زیارت صرف تہواروں تک محدود ہو کر رہ گئی اور جب ہماری زندگیوں میں مصروفیتوں اور دلچسپیوں کے تصور نے اپنے جال پھیلائے تو ہم نے قبرستان جانا بالکل ترک کر دیا۔

قرطبہ کے سٹیشن سے پرے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نہر کا ایک بنگلہ ہے، بنگلہ کے ساتھ نہر بہ رہی ہے۔ اس کے ساتھ قبرستان میں میرے بھائی اور دادی کی قبریں ہیں اور ان کے ساتھ اور بہت سے ایسے لوگوں کے مدفن ہیں جنہیں میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، جن سے میں بارہا ملا تھا یا جن کے متعلق میں نے اپنے والد، اماں اور نانی سے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ سفر کی صعوبتیں برداشت کرنے اور در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد میں آج بڑی مشکل سے اپنے گاؤں پہنچا تھا اور میرے اپنے گاؤں کے لوگ جنہوں نے ہمارے چلے جانے کے بعد ہماری ہر چیز پر قبضہ کر لیا تھا شک اور حیرت کی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں، جیسے مجھے پہچان کر اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہوں کہ نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا بھلا اس میں وہ جرأت کہاں کہ ہماری سرزمین پر قدم رکھ سکے ہماری مملکت کی سرحدوں کو چھو سکے!

چیتھڑوں اور پیوندوں کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے ہسپانوی موسیقار ابھی تک گٹار بجا رہا تھا اور مزدور اپنی اپنی کرسیوں پر رات ہوشیار آنکھوں میں دبائے جھوم رہے تھے۔ دفعتہً گٹار بجانے والے ست رنگ نے نگاہیں میری طرف پھیریں اور اپنا ساز کرسی پر چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ کھردرے ہاتھوں سے دو مرتبہ تالی بجا کر اس نے کندھوں کو زور سے جھٹکا اور پھر قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اس کی آواز پر دوسرے لوگ بھی کھلکھلا کر ہنس دیے، اور میں نگاہیں نیچی کر کے جیبیں ٹٹولنے لگا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر کارمن خانہ بدوشوں کی طرح تالی بجائی اور ایک جھرجھری لے کر سرو قد ساکت ہو گیا۔ ریستوران کے لڑکے نے میری طرف دیکھا۔ آگے بڑھ کر گیلے کپڑے سے میز صاف کی اور سر اور کندھے جھکا کر پوچھا "کافی سے نیور؟"

موسیقار ایک بار پھر تڑپا اور اپنی کمر کو گرمٹ برمے کی طرح دو بل دے کر زور سے پکارا "اولے"!

دور بیٹھے مزدوروں نے ایک ساتھ تالی بجائی اور پکارے کافی! کافی!! کافی!!!

ہسپانوی موسیقار چٹکیاں بجاتا ہوا میرے گرد گھومنے لگا جیسے لگس کے گرد تار بن رہا ہو۔ کمر لچکاتے، کندھے سکوڑتے پھٹے بوٹ کی ایڑیاں زمین پر بجاتے اس نے تین چار چکر میری میز کے گرد لگائے۔ پھر رک گیا۔

مزدور ایک ساتھ تالی بجا کر پکارے: کافی! کافی!! کافی!!!

موسیقار نے میرے سامنے اپنی ہتھیلیاں میز کے کناروں پر رکھ دیں اور میری آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ پریدہ رنگ دریدہ چشم قلندر کی نگاہ میرے دل میں خسرو کی نعت بن کر چھری کی طرح اتر گئی۔ مجھے یوں مضطرب دیکھ کر اس نے ایک مرتبہ پھر سر جھٹکا اور زور سے پکارا "اولے"!

مزدوروں نے قہقہہ لگا کر اور زور سے تالیاں بجائیں اور ان کی آواز گویا مسجد قرطبہ کی محراب میں قرأت بن کر گونجی۔

موسیقار پنجوں پر تھرکا۔ ایڑیوں پر سنبھلا اور اپنے دونوں بازو بک سیر طائر کی طرح پھیلا کر میری طرف اڑا۔ مزدور اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو کر سکرانے لگے۔ گدڑی پوش جیسے سماع کی محفل میں طالب صادق کی طرح تڑپنے لگا۔ دونوں ہاتھوں سے تیز تیز چٹکیاں بجاتا چلنت لے میں ہسپانوی گیت گاتا وہ میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

مزدور چلائے: کافی! کافی!! کافی!!!

میں نے خوفزدہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

پاکوب درویش میری جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا اور صلع کل لوگوں کی مجلس کو انکسار رہا تھا۔

کون آیا پہن لباس کڑے   تسیں پچھو ناں اخلاص کڑے

جب اُس کی پاٹ دار آواز مین میرے سر پر گونجنے لگی تو میں نے آنکھیں کھول کر اُس طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے مزدوروں کی طرف اشارہ کرتا اور پھر انہیں میری طرف اُگساتے ہوئے گویا کہتا:

چاک چاکر نہ اس نوں آکھوں   امید نہ خالی گھجڑی گھا توں
وچھڑیا ہویا پہلی را توں   آیا کرن تلاش کڑے

جب "آیا کرن تلاش کڑے" کا نعرہ لگتا تو وہ اپنی تنی ہوئی باہوں کی سیدھی انگلیاں طمنچوں کی طرح میری طرف تان دیتا۔

درت کے اس بول کے پیچھے مزدور کافی کافی کی صدائیں بلند کرتے اور پھر اپنے جسموں کو چٹکیوں کی تانوں میں محصور کر لیتے۔

درویش کو پتہ چل گیا تھا کہ یہاں میرے اب وجد دفن تھے اور رشتہ و پیوند کی یہ کشش مجھے اتنی دور کھینچ لائی تھی۔ آج سے چند صدیاں پیشتر واقعی میرا یہ لباس نہ تھا لیکن اب حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور اپنی ذات چھپا کر میں چوروں کی طرح اسی گھر میں سیند لگانے آیا تھا جہاں ہم سب مل کر رہا کرتے تھے۔ میرا پڑدادا شہر کا کوتوال رہا تھا۔ میرا دادا قرطبہ کی دانش گاہ میں رومی قانون پڑھاتا تھا اور میرا باپ سلطانی ہطار تھا۔ بیچاری دادی سارا دن کھجوروں کا شیرہ تیار کر کے انہیں روغنی مرتبانوں میں بھرا کرتی اور اماں زیتون کا تیل بیچنے والی ان یہودنوں سے بجاؤ چکایا کرتیں جو بات بات پر لمبی لمبی قسمیں کھاتیں اور مرونگ ایسے مرتبانوں پر لیمے سے ہاتھ رکھ کر یونہی بے معنی سی ہنسی ہنسے جاتیں۔

میں نے اپنے کوٹ پتلون اور ٹائی کی طرف چور نگاہوں سے دیکھا۔ قدموں میں پڑے ہوئے چرمی تھیلے کو پیر سے پرے کھسکایا اور موقع پر پکڑے جانے والے چور کی طرح ہسپانوی موسیقار کی طرف دیکھا۔ اس کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ منہ سے جھاگ بہنے لگا تھا اور وہ دم توڑتے لٹو کی طرح آخری چکر کاٹ رہا تھا۔ شاید اُسے حال آگیا تھا یا آنے والا تھا۔ یا پتہ نہیں وہ اس کیفیت سے واپس گزر رہا تھا۔ میں نے اس خطرناک فضا میں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ آہستہ سے اپنا تھیلا اُٹھایا اور چپکے سے باہر نکل آیا۔ ریستوران کا گارڈ دروازے کے باہر تک سے نیور اِسے نیو را کرتا میرے پیچھے آیا لیکن میں نے پلٹ کر دیکھا نہ اُس کی بات سننے کی کوشش کی۔

سورج کی بہی کرنیں آسمان سے نیچے اُتر آئی تھیں اور بڑی سڑک کے کنارے کھجوروں کے جھنڈ میں سے ہوتی ہوئیں زمین پر پہنچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ بڑی اور عمر رسیدہ کھجوروں کے قدموں میں خرما کی نوخیز جھاڑیاں ان کرنوں سے بری طرح اُلجھی ہوئی تھیں۔

یہ سڑک خدا جانے کدھر جاتی تھی، کدھر سے آتی تھی اور اس کے کنارے اللہ جانے کن لوگوں کے گھر تھے۔ میں چلتا رہا چلتا رہا اور یہ امید بار بار میرے دل میں آپ سے آپ اُبھرتی رہی کہ ابھی مجھے دریائے کبیرہ چوڑا چکلا پاٹ نظر آئے گا۔ ابھی اس پر چابی دار محرابوں کا پُل دکھائی دے گا اور ابھی مجھے وہ منار بلند وہ جلوہ گر جبرئیل شفقت سے دیکھے گا جس کے قدموں میں مسجد قرطبہ اور اس کا صحن پھیلا ہوا ہے۔

دودھ کے جستی کین لادے مجھے راستہ میں وہ گاڑی ملی جسے اعلیٰ نسل کا ایک عربی گھوڑا کھینچ رہا تھا۔ کوچوان مٹیالے رنگ کا بوسیدہ سوٹ پہنے آنکھوں پر غلیظ فیلٹ کھینچے گھوڑے کو قدم قدم چلا رہا تھا اور اس کے پیچھے ایک کسان لڑکی ہاتھ میں سبزی کی ٹوکری اٹھائے چلی آرہی تھی۔ میں لمحہ بھر کو ٹھٹکا اور دختر دہقان نے گیت پر کان لگا دیئے۔ لڑکی کے ہونٹ بند تھے۔ آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھلی تھیں۔ سکرٹ پر چکنائی کے داغ تھے اور سفید پنڈلیوں پر وہ ارغوانی نشان تھے جو پھلواڑی میں تازہ سبزیاں توڑتے ہوئے آپ سے آپ اُبھر آتے ہیں۔ میں نے کہا، یہ ضرور کسی بڑے گھر کی خادمہ ہے۔ اگر دختر دہقان ہوتی تو گیت گاتی ہوئی چلتی اور کوچوان کی جیکٹ، فیلٹ اس کی آنکھوں پر یوں نہ کھینچی ہوتی!

دور سڑک کے اگلے موڑ پر دریائے کبیر کی مست رو لہروں پر سورج کی کرنیں بے تابانہ ناچ رہی تھیں۔ دریا کی چمکتی ہوئی سطح دیکھ کر میرے دل میں ایک ہی خوف کو رموش کی طرح ادھر اُدھر ٹکرانے لگا کہ اگر میں کنارے تک پہنچا پہنچتا مر گیا تو کیا ہوگا! بالکل ایسے ہی ایک مرتبہ پہلے بھی یہی خیال میری جان کا لاگو ہو گیا تھا جب میں تاج محل کی بڑی ڈیوڑھی میں داخل ہوا تھا۔ اُس دن تو جان بچ گئی تھی لیکن اب کے آثار کچھ اچھے دکھائی نہ دیتے تھے۔ میں نے جیب سے پیپرمنٹ کی ایک گولی نکال کر منہ میں ڈالی آنکھیں بند کیں اور سڑک کے کنارے سورج کی

طرف منہ کرکے دو تین لمبی لمبی سانسیں لیں۔ دل کی دھڑکن جو پہلے بیچ میں ایک دو غوطے مار گئی تھی پھر استوار ہوگئی اور میں دریا کی جانب چل دیا۔

سڑک کی سطح سے نیچے کوئی پندرہ بیس فٹ گہرے نشیب میں کسانوں کے چند کچے کوٹھے تھے جن پر اہریا ٹین کی چھتیں پڑی ہوئی تھیں۔ سورج کی روشنی میں ایک دوسری سے ملی ہوئی یہ چھتیں دور سے بل کھاتا ہوا دریا دکھائی دیتی تھیں۔ آب روان کبیر!

سان پابلو سڑک پر ایک معمولی سے "پانسی اون" میں میں نے ایک چھوٹا سا کمرہ لیا۔ ٹھنڈے پانی سے حجامت بنائی۔ لوہے کے تسلے میں ایلومینیم کے جگ سے سر کی دھول اور کانوں کی ریت صاف کی۔ دانت صاف کرکے پیپرمنٹ کی ایک اور گولی منہ میں ڈالی اور تھیلا بستر پر چھوڑ کر نیچے مالکہ کے پاس پہنچ گیا۔ ضابطے کے مطابق تھانہ بھیجے جانے والے "مقصد تشریف آوری" کے دو فارم بھرے اور پاسپورٹ مالکہ کے حوالے کرکے سٹیشن سے اپنا اٹیچی کیس لینے چل دیا۔

صبح کے واقعہ سے ذہن پہ ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ میں ہسپانیہ کی سیر کرتا یونہی اس تاریخی مقام پر آپہنچا تھا۔ اس علاقہ کے کھنڈرات یا اس سرزمین کے تاریخی پس منظر سے مجھے کوئی قلبی یا روحانی تعلق نہ تھا۔ صحیح تعلیم نے ایسی بالغ نظر عطا کر دی تھی جو ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ یورپ میں دو سالہ قیام خاص طور پر مفید ثابت ہوا اور میں مذہب و مسلک کے فضول جھگڑوں سے اور بھی آزاد ہوگیا۔ انسانیت کے وسیع سمندر میں مذاہب کے چھوٹے جزیرے ترقی کے بڑے بڑے جہازوں کی راہ مار رہے تھے اور میرے والدین کا مذہب ایسا تھا جو سب سے زیادہ تنگ نظر، تکلیف دہ اور دراز دست نظر آتا تھا۔ اطالیا میں جب میرے آزاد خیال اور وسیع القلب بردیسی دوست اس مذہب پر نکتہ چینی کرتے تو میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاتا اور اس کی جزئیات پر تفصیل سے بحث کرتا۔ مگر آج صبح اس علاقے کی فضا نے پتہ نہیں مجھ پر کیا جادو کیا کہ سٹیشن پر اترنے سے پیشتر مجھے اس خطے کی زمین آسمان نظر آنے لگی۔

سیدھی انگلی پر چابیوں کی زنجیر گھماتے میں اسٹیشن کی جانب چلا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا عربوں کی تہذیب اور تمدن سے مجھے کیا واسطہ۔ طارق نے کشتیاں جلا دیں تو اچھا کیا۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ روا

ہے! لیکن یہ کہ ہم ان لوگوں کو اپنے سمجھ کر ان پہ یہ بڑے بڑے جہازی ناول لکھنے لگ جائیں یا ان کی کمزوروں کے مرثیے پڑھنے لگیں.....

اور پھر..... پھر..... مگر یہ کہاں کی عقلمندی ہے! کہاں کا جذبہ ہے! بس اک بات تھی سو ہو ہوا گئی۔ نہ انہوں نے سوچ سمجھ کر ہمارے لیے کچھ کیا نہ ہم..... نہ ہم..... بلکہ الٹا ہمیں نقصان پہنچا۔ پتہ نہیں صبح مجھے کیا ہوگیا تھا جو اس بھک منگے مراثی کے سامنے تصورات کی دنیا بسا کر خواہ مخواہ خفیف ہوا۔ ناشتہ کیے بغیر بھاگ کھڑا ہوا اور دریائے کبیر کو آب حیواں سمجھ کر سراب کی طرف لپکتا رہا۔

رسل، ہکسلے، جینز، مارکس، فرائیڈ کی صد سالہ کاوشوں کے قصے اور ان کی تعلیمات کی کہانیاں میری مدد کو آگے بڑھیں اور میری راہ آسان ہونے لگی۔ میں نے کہا میاں تم خود مڈل پاس کرنے کے بعد سے لے کر اب تک پاپولر مکینکس اور پاپولر سائنس پڑھتے رہے ہو۔ فزکس نے جہاں ہاں کر دی ہے وہاں ہاں رہی ہے اور جہاں نہ کر دی ہے نہ رہی ہے۔ اب کون بھلا مانس مولوی یعقوب کے ان دلائل کو سنے جائے گا کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ یہ اتنا وسیع و عریض نظام کائنات، یہ چاند، سورج، ستارے، سیارے آخر انہیں بنانے والا بھی تو کوئی ہے نا۔

ایف اے کے بعد ہم سب مولوی جی کی اس دلیل پر ہنس پڑا کرتے تھے۔

"اچھا جی! تو پھر مولوی صاحب؟"

"بس وہی خدا ہے!" مولوی یعقوب نے جواب دیا۔

"اور اسی نے نبی بھیجے کہ جاؤ اور جا کر۔"

مولوی صاحب طیش میں آکر مکا دکھاتے اور چلا کر کہتے "فقرہ ختم کیا تو ناک توڑ دوں گا۔"

ہم سب کھی کھی کرکے ہنس پڑے۔

اسحاق کہتا "قربان جاؤں اُس کے جس نے ٹوٹی پنسل سے پھٹے ہوئے کاغذ پر لکھ دیا مائع اپنی سطح ہموار رکھتے ہیں۔"

مولوی صاحب غصے سے دیوانے ہو کر اپنی بدھنی چھلکاتے اور چیخ کر کہتے "دیکھ تیرا باپ پانی کدھر سے اپنی سطح ہموار رکھتا ہے۔" بدھنی کی ٹونٹی سے پانی کے چھپاکے کچھ زمین پر کچھ ہمارے کپڑوں پر گرنے

گھتے اور ہم اور زور زور سے ہنستے!

پہیہ۔ بال بیرنگ۔ ویلو۔ کھتوڈ۔ فوڈ سیں میں نے اپنے بیہودہ دل سے کہا:

"برخوردار کیوں دیوانہ ہوا ہے قرطبہ میں تو بس چمڑے کا کام ہوتا تھا اور وہ بھی ایسا کہ دی بیلٹ نہ بنتے تھے شکیزے تیار ہوتے تھے۔ دل نے جواب دیا، چلو سرخ شراب پئیں مگر اس شرط پر کہ کوئی قرطبن ساتھ ہو۔"

میں نے کہا بات ہوئی نا!

اور چابی کی زنجیر میری انگلی پر مونٹم کے ساتھ خود بخود کھلتی اور بند ہوتی رہی!

اور نٹیل کالج لاہور کی جانب سے چڑھائی چڑھتے ہوئے چنگڑ محلے کا جو علاقہ آتا ہے اس میں بائیں ہاتھ کو پہلے شاید دو تین ٹھٹھیروں کی دکانیں ہیں ان کے آگے کچھ گرے پڑے کر تھے اور ٹوٹے پھوٹے چبوترے ہیں۔ بالکل ایک ایسی جگہ پر شکستہ دیواروں، اینٹوں سلوں اور بوسیدہ بلتیوں میں گھری ہوئی زمین سے کوئی فٹ بھر اونچی کرسی پر پھوس اور سرکنڈوں کے دھونسے ہوئے چھپر تلے قرطبہ کی لڑکی پکوان پکا رہی تھی۔ چند اینٹیں جوڑ کر اس نے عارضی چولہا بنایا ہوا تھا۔ اس پہ لوہے کی کڑاہی دھری تھی۔ زیتوں کا کچھ تیل اس میں کڑک رہا تھا باقی کا اس سفید بوتل میں پڑا تھا جس کا منہ بھٹے کے گل سے بند کیا ہوا تھا۔ لڑکی گندھے ہوئے آٹے کو سگرٹ کے ڈبے میں ڈال کر زور سے دباتی نیچے ہشت پہلو سوئیں برآمد ہوتی جسے وہ اپنی ویسی ہی انگلی سے توڑ کر دونوں سرے جوڑ کر اور ایک کر کلا سا بنا کر تیل میں چھوڑ دیتی۔ میں یونہی مونٹم میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

یہ لڑکی شکل سے پندرہ سولہ برس کی ہو گی مگر کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے اس کے چہرے پر جوان عورتوں کی سی سنجیدگی نمایاں تھی۔ چہرہ بیضوی تھا، ماتھا فراخ، بھویں لمبی اور جھکی ہوئی، آنکھوں کے چھوٹے شبالی سے۔ اس نے سفید ٹول کی نصف آستینوں والی قمیص پہن رکھی تھی اور ملیشیا کے سکرٹ پر پرانی برساتی کا کپڑا ڈالے بڑے انہماک سے کہ کلے تل رہی تھی۔ اس کے گلے میں سمندری سیپ سے تراشی ہوئی ایک صلیب آویزاں تھی اور قمیص کے کالر پر پیتل کا ایک چھوٹا سا پیچ یا گھوڑا لگا ہوا تھا۔

میں چھپر کی ایک بتی سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ سے بولا "سینوریتا!"

اس نے نگاہیں اُوپر اٹھائیں اور کالی سیاہ آنکھوں سے تکتے ہوئے ہسپانوی میں پوچھا کیا ہے؟"

میں نے چابیوں کی زنجیر ٹانگ کے متوازی جھلاتے ہوئے بڑی مسمی شکل بنا کر اطالوی میں پوچھا کیا کر رہی ہو؟"

وہ مسکرانے لگی اور سر ہلا کر بولی "میں تمہاری بولی نہیں سمجھتی۔" اس فقرے سے میں بار سلونا اور میڈرڈ میں بخوبی واقف ہو گیا تھا اور اب مجھے کچھ ایسی کوفت نہ ہوتی تھی۔ مگر اس لڑکی نے یہ اعلان کر کے کہ وہ میری عرض معا نہیں سمجھتی مجھے آزردہ کر دیا۔ میں ایک اینٹ کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گیا اور اطالوی کے ہر لفظ کے پیچھے ایس اور سین کی کٹی ہوئی آواز چپکا کر ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے سے اُسے سمجھانے لگا کہ میں ہسپانوی زبان ٹھیک سے نہیں بول سکتا۔ اُس نے کڑاہی سے چھلنی بھر کر کلے باہر نکالے۔ حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولی "تم ہسپانوی نہیں ہو؟"

میں نے اپنے سینہ پر دو مرتبہ آہستہ سے ہاتھ بجا کر جواب دیا "ہوں تو میں ہسپانوی لیکن اپنی بولی نہیں جانتا۔"

اس کا ہاتھ رکا، منہ کھلا، آنکھیں پھٹی رہ گئیں!

میں نے سر جھکا کر عاجزی سے کہا "سچ عرض کرتا ہوں میں اسی ملک کا باشندہ ہوں۔"

لڑکی نے قدرے تامل سے پوچھا "اطالوی ہو!"

میں نے کہا "سوئے اتفاق سے اُدھر جا نکلا تھا ورنہ دراصل میرا ملک یہی ہے۔" اس نے گندھے ہوئے آٹے کے تسلے کی طرف منہ پھیرتے ہوئے آہستہ سے کہا "خدا جانے کون ہو۔"

جب اس نے لمبی ہشت پہلو سوئیں کو کاٹ کاٹ کر انگلی اور انگوٹھے کی کھاکلی جنبشوں سے اس کے چھ سات کر کلے تیار کر لیے تو جب کچھ جانتے ہوئے میری طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو "ابھی تک تم یہیں بیٹھے ہو!"

میں نے رنٹ چولہے کے قریب کھینچ کر پھونس اور چولہے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں سے پوچھا "ایندھن جھونکتا جاؤں؟"

اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔

میں نے جیب سے ایک پیسا نکال کر ویسے ہی پوچھا "ایک پیسے کے کتنے؟"

اس نے جواب میں کچھ کہا تو میں نے میڈرڈ اور بارسلونا سے سیکھے ہوئے فقرے کو اس کے قدموں میں ڈال کر کہا "میں تمہاری بات نہیں سمجھا۔"

اس نے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں کھول کر بائیں ہاتھ کی سیدھی انگلی اُن سے ملا دی۔ گوری قرطبن کا جل پری ایسا چھوٹا سا ہاتھ آٹے کے ملغوبے میں ڈوب ڈوب کر بہت ہی ملائم ہو گیا تھا۔ ابھی جب اس نے تسلے کے کنارے پر کلائی سے لے کر آخری پوروں تک ہاتھ کھینچا تھا تو بہت سا خون ہتھیلی کی طرف یورش کر کے اُسے عنابی بنا گیا تھا اور ہارٹ لائن اتنی گہری نظر آنے لگی تھی کہ دوسری لکیریں اس کے سامنے ماند پڑ گئی تھیں۔ ہتھیلی کے کناروں اور انگلیوں کی درمیانی دراڑوں پر آٹے اور شیرے کی سوکھی ہوئی حدوں نے سارے ہاتھ کو یہ بجنا سا پیارا بنا دیا تھا۔ میں نے جلدی سے دیکھا اس کی ہتھیلی پر سمندری سفر کی لکیر بھی موجود تھی۔ اُسے دیکھ کر میرے کلیجے میں ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ میں نے جلدی سے سر ہلا کر کہا "ٹھیک ہے۔" اور پیسا چولہے کے پاس رکھ دیا۔

لڑکی نے تسلے کے پاس پڑے سبز سرکنڈوں کی ایک پتلی سی سینک اٹھائی اور اس میں چھ کو کلے پرو کر مجھے دے دیئے۔ میں نے ان سے ایک اتار کر کھایا تو اس میں مال پوئے کا سا مزہ تھا۔ چھوٹے بچے کی طرح مزے سے سر ہلاتے ہوئے میں نے قرطبن سے پوچھا "یہ کیوں کر بنتے ہیں؟"

اس کی ناک کے اُوپر ماتھے کی ایک چھوٹی سی سلوٹ سوالیہ نشان بن کر اُبھری مگر جلد ہی وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے تسلے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "یہ؟"

میں نے کہا "ہاں ہاں یہی"

لڑکی نے برساتی اپنے گھٹنوں پر کھینچ کر کہا "آٹا ہوتا ہے نا۔ آٹا!"

میں نے کہا "ہاں۔"

"بس وہ آٹا اور...... ملا کر پانی میں گھول کر بناتے ہیں۔"

"...... یہ کیا" میں نے پوچھا۔ کوئی نیا سا ہسپانوی لفظ تھا مگر جواب کے لیئے وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے ہاتھ مل کر بتیاں اتاریں اور چولہے میں ایندھن جھونکنے والی بانس کی سونٹی زمین سے اٹھا کر یوں مزے سے لگائی، جیسے رادھا کرشن کی بانسری چھین کر پھونکنے لگی ہو۔ سفید سفید دانتوں کی لڑی میں اس نے بانس کی ٹوری کا ایک کنارہ ہونٹوں سے پکڑا اور یوں مصنوعی سا جھٹکا دیا جیسے ٹوری چھیلنے لگی ہو۔

"اوہو گنا! گنا!!۔" میں چلایا۔

"گانا!" وہ میری طرف دیکھ کر ہنس پڑی۔ اور میں نے فوراً رومال نکال کر اُسے نچوڑنے کے انداز میں بل دیا جیسے گنا بیلا جا رہا ہو۔ لڑکی نے میری سمجھ کی داد دیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور چولہے کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے اس پر رس کے کڑاہے چڑھے ہوں۔

"گڑ گڑ!" میں پھر چلایا۔

"گر!" اس نے حیرت سے آنکھیں نچائیں۔

"ہاں ہاں کامل بہارہ مع گر" میں نے اپنے آپ کو خوش کرنے کے لئے کہا۔

اس دوران میں میں چھ کے چھ کو کلے کھا چکا تھا۔ اور میرے ہاتھ میں صرف سرکنڈے کی سینک باقی رہ گئی تھی۔

لڑکی کو کڑاہی کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر میں نے ایک پیسا جیب سے اور نکالا اور آگے بڑھا کر کہا "چھ اور"

اس نے میرے ہاتھ سے پیسا اور سینک دونوں لے لیے تو میں نے بانس کی سونٹی سے آہستہ آہستہ چولہے میں پھونس جھونکنا شروع کر دیا۔

لڑکی نے مجھے بھری ہوئی سینک واپس دیتے ہوئے کہا "مگر تم ہسپانوی تو نہیں ہو؟"

میں نے گرم گرم کو کلا منہ سے نکال کر کہا "خدا کی قسم میں ہسپانوی ہی ہوں۔"

اس نے آٹے کی لئی ڈبے میں ڈالتے ہوئے پوچھا "مشرق مغرب شمال جنوب، کون سے علاقے کے؟"

میں اس کی یہ بات سن کر ایک بار پھر آزردہ ہو گیا اور بڑے پیار سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میں مور ہوں اور میرے باپ دادا اسی علاقے کے رہنے والے تھے۔ ہم ہلاکو اور چنگیز کی طرح یہاں نہیں

ئے تھے بلکہ نئی بستیاں بسانے اور خوبصورت باغ اُگانے آئے تھے۔"

اس نے ڈبہ واپس تسلے کے پاس رکھ دیا اور گھور گھور کر میری طرف دیکھنے لگی پھر میری طرف اُنگلی تان کر بولی "مسلمان؟"

میں نے شکست خوردہ سپاہی کی طرح سر جھکا کر کہا "ہاں"۔

لڑکی کی آنکھیں الاؤ کی طرح دہکنے لگیں۔ اس نے زمین پر تھوک کر کہا "ہونہہ مسلمان! مور!"

رسل، ہکسلے، جیمز جینز کا سارا علم مجھے عین وقت پر دھوکا دے گیا اور میں نے اثاثہ لٹے مسافر کی طرح سر جھکا کر کہا "ہم اتنے بُرے نہیں، اس قدر ذلیل نہیں ..... ایسے کمینے ....."

مگر اس نے میری بات بیچ میں ہی کاٹ دی۔ شاید وہ جلدی جلدی گالیاں دے رہی تھی اور اسے نئے نئے کوسنے آسانی سے سوجھتے نہیں تھے۔

اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر میں نے ایک مرتبہ کہنا بھی چاہا کہ میں مذہب ودہب میں کچھ ایسا اعتقاد نہیں رکھتا میں تو صرف آزاد آدمی، انسان دوستی اور رواداری کا قائل ہوں۔ بال پیرنگ، وہیلو اور نوڈ سیل بنانے والوں کو پیغمبروں پر ترجیح دیتا ہوں لیکن پتہ نہیں مجھے کیا ہوا کہ میری زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔

ایک مسلمان گھرانے میں اپنی عمر کا بیشتر حصہ گزار کر پرورش ہو جانے کی وجہ سے یا شاید کسی اور سبب سے میں اس کو یہ بات کہہ نہ سکا اور سر جھکا کر ہر بات تسلیم کرتا چلا گیا۔ اس بوچھاڑ میں وہ ایک مرتبہ رکی اور قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئی بولی "اٹھو، میری دکان خالی کر دو"

میں نے مظلوموں کی طرح اُس کی طرف دیکھا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بڑی لجاجت سے کہا "سینوریتا! مجھے معاف کر دیجئے"۔

وہ سر کو جھٹکا دے کر کرخت آواز میں بولی "مور اور یہ لجاجت"

میں نے پھر نظریں جھکا لیں اور جواب میں آہستہ سے کہا "ہم بھی تو ایسے نہ تھے۔ آپس میں لڑتے تھے مگر رعایا پر تشدد تو نہ کرتے تھے۔ آپ امیر عبدالرحمان کو نہیں جانتیں انہوں نے اسی شہر میں ایک برج بنوایا تھا اور اپنے آبائی ملک سے کھجور کا پودا منگوا کر یہاں بویا تھا۔ برج کے باوئی کٹہرے پر کھڑے ہو کر وہ پودے کو پروان چڑھتے دیکھا کرتے۔ اپنے وطن کی یاد میں شعر کہتے۔ زریاب مغنی سے عود پر نغمے سنتے اور علم و ادب اور فنون لطیفہ کے پرستاروں کو منہ مانگی مرادیں دیتے۔ انہی بادشاہوں میں الحکم ثانی بھی تو تھے جنہوں نے دنیا کے ہر گوشے میں اپنے گماشتے محض اس لیے بھیج رکھے تھے کہ جہاں بھی کوئی نئی کتاب لکھی جائے ..."

اس نے چڑ کر کہا "میں کسی کو نہیں جانتی۔ مور سب کے سب قصائی تھے اور تو سانپ کا بچہ سنپولیا ہے"۔

میں نے کہا "یوں نہ کہو، مجھے دکھ ہوتا ہے۔ تم بھی تو ہمارا ہی خون ہو اور رشتہ و پیوند کے ان جھمیلوں سے کوئی نیوٹن، کیوری اور آئین سٹائین جیسا بھی پنڈ نہ چھڑا سکا"۔

دختر قرطبہ نے تنگ کر کہا "بکواس مت کرو"۔

میں خاموش ہو گیا تو اس نے تازہ تلے ہوئے کوکلوں کو مٹی کے روغنی پیالے میں ڈال کر تسلے کے ملغوبے کو دائیں ہاتھ سے گوندھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد سر گھما کر میری طرف دیکھا اور قدرے نرمی سے پوچھا "کہاں ٹھہرے ہو؟" میں نے بانس کی سونٹی سے چولہے میں پھونس جھونکتے ہوئے جواب دیا "پاتیو پالنسی اوں میں"۔

پوچھنے لگی "یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

میں نے کہا "اپنوں سے ملنے کی تمنا کھینچ لائی ہے"۔

لڑکی نے آٹا گوندھنا بند کر دیا اور ماتھے پر سلوٹ ڈال کر بولی "یہاں تمہارا کون ہے؟ اور تم کہاں سے اُسے ملنے آئے ہو؟"

میں نے سر جھکائے، پھونس جھونکتے، ہولے سے کہا "یہاں ہمارے شاہ عنایت رہتے ہیں۔ تم انہیں نہیں جانتی ہو مجھے بھی ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا لیکن وہ ہیں یہیں اسی بستی میں اسی حرم پاک میں کہیں چھپے ہوئے۔ تمہیں پتہ نہیں!

عرش منور ملیاں بانگاں سنیاں تخت لہور
شاہ عنایت کنڈیاں پایاں لک چھپ کھچدا ڈور"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور سامنے سڑک صاف کرنے والے ایک دیوہیکل آدمی کو "فردی نانڈو! فردی نانڈو!" کہہ کر پکارتے ہوئے اونچی آواز میں چلائی "ذرا اسے دیکھنا۔ پتہ نہیں کونسی بولی بول رہا ہے اور کہتا ہے میں مور ہوں ..... مور"۔

ہنستے ہنستے اس نے گھٹنوں میں سر دبا لیا۔ فردی نانڈو جھاڑو

چھوڑ کر چھپر کے پاس آگیا اور گرج کر بولا کون ہو تم" میں نے اپنا تھیلا اُٹھایا کانپتی ہوئی ٹانگوں سے اٹھا اور چلنے لگا تو فیرڈی نانڈو نے لڑکی سے پوچھا "یہ مور ہے!"

اس نے گھٹنوں سے سر اُٹھا کر ہنسی سے بے جان ہوتے ہوئے دو تین مرتبہ اثبات میں سر ہلایا اور پھر کچے فرش پر لیٹ گئی۔ فیرڈی نانڈو نے غور سے اس کی پنڈلیاں دیکھیں پھر ایک آنکھ میچ کر لچوں کی طرح میری طرف دیکھا اور اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ چھپر کے پاس کاغذ کی جھنبیریاں لے جاتے ہوئے دو لڑکے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر فیرڈی نانڈو کی طرف دیکھنے لگے۔

میں کسی بات کا جواب دیے بغیر چھپر کے کچے چبوترے سے اُترا اور سٹیشن کے بجائے شہر کی طرف تیز تیز قدم اُٹھانے لگا۔

قرطبہ کی پتھروں کی قدیم سڑک گاڑیوں کے پہیوں اور گھوڑوں کے سموں سے جگہ جگہ سے دب گئی تھی اور پتھروں کے گول گول ٹکڑے سورج کی کرنوں تلے بلور کی طرح چمک رہے تھے۔

اگلے چوک پر تمباکو کی ایک چھوٹی سی دکان کے سامنے تین شکاری کھڑے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں دو نہایت ہی خوبصورت حجازی کتوں کی ڈوریں تھیں۔ دوسرے کے گلے میں شراب کی چھاگل لٹک رہی تھی اور تیسرا بارہ بور کا گھسا پٹا دستہ اپنے کرخت بوٹ کی ٹو پر بجا رہا تھا۔ میں نے ان کے قریب جا کر اطالوی میں پوچھا "مسجد کہاں ہے؟"

چھاگل والے نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ کتوں والے نے عرب میزبان کی طرح محبت سے میرا کندھا تھپک کر پوچھا "لا مزکیتا؟" میں نے سر کے اشارے سے ہاں کہا تو اس نے سامنے بازو تان کر کہا "سیدھے چلے جاؤ، اگلا چوک چھوڑ کر اس سے اگلے موڑ پر بائیں ہاتھ کو مڑ جانا۔"

میں نے اپنی کلائی پر گھڑی دکھاتے ہوئے پوچھا کتنی دیر لگے گی؟

تو چھاگل والے نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کھول کر کہا "یہی کوئی دس منٹ۔"

بندوق والا بدستور اپنی ٹو پر دستہ بجاتا رہا۔

میں شکاریوں کی ہدایات کے مطابق جلدی جلدی آگے بڑھنے لگا۔ دھوپ کافی تیز ہو چکی تھی اور چلنے کی وجہ سے کچھ گرمی کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس وقت قرطبہ دار الخلافہ ہونے کی وجہ سے اندلس کے سارے شہروں میں ممتاز حیثیت رکھتا تھا آبادی کوئی دس لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ شہر میں اسی ہزار چار سو دکانیں، سات سو مسجدیں، نو سو حمام اور ساڑھے چار ہزار گودام تھے۔ یہ خوشحال اور متمدن شہر وادی الکبیر کے کنارے آباد تھا۔ ساری سڑکیں پتھر کی تھیں اور گرمیوں میں ان پر خیمے تن جاتے تھے تاکہ آمد و رفت میں آسانی رہے۔ کاش ان سڑکوں پر کم از کم شہر کے اندرونی کوچوں پر اب بھی کوئی تنبو تان دیا کرے تاکہ لوگوں کو چلنے پھرنے میں آسانی ہو، یہ سوچ کر اور ایسی ان ہونی تمنا کو اپنے پہلو میں جگہ دے کر مجھے اور بھی گرمی لگنی شروع ہو گئی!

بڑا چوک گزر کر اور اگلے موڑ پر بائیں ہاتھ کو مڑ کر تنگ گلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک لمبی سی گلی میں چلتے چلتے میں ایک پنساری کی دوکان پر ٹھٹکا اور باہر سودا لیتی ہوئی ایک بڑھیا سے پوچھا "لا مزکیتا؟" اس نے سودے کی تھیلی پر رسی لپیٹتے ہوئے ہاتھ سے آگے کو اشارہ کیا اور میں پھر روانہ ہو گیا۔ اس سنسان گلی میں پرانی وضع کے پانچ چھ چونے گچ گھر گزرنے کے بعد مجھے ایک نوجوان لڑکا دکھائی دیا جو گلی کے بیچوں بیچ آدھی آستینوں کی قمیص اور نیلی پتلون پہنے کھڑا تھا اور دونوں باہیں اوپر کو اُٹھا رکھی تھیں۔ چھوٹے سے گھر کے نیچی چھت والے بالا خانے کی کھڑکی میں ایک صحت مند لڑکی پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور ادھ کٹے ترنج کو چھلکے سمیت دانتوں سے توڑ توڑ کر کھا رہی تھی جب اس کے منہ میں بیج آ جاتا تو گلے پھلا کر سرخ سرخ ہونٹوں کو حلزون کی منہ بند ہتھیلی کی طرح سکوڑتی اور "پش" کر کے ہوائی بندوق لڑکے کی طرف داغ دیتی۔ لڑکا اپنے جسم پر چہرہ لگ پھٹنے کے بعد سنا ہوا بیج زمین سے اُٹھاتا اور اپنے منہ میں ڈال لیتا۔ میں تو یہاں محض اس لیے رک گیا تھا کہ مجھے مسجد کا راستہ پوچھنا تھا۔ جب ان کے کھیل میں ثانیہ بھر کا انٹرول بھی نہ ہوا تو میں پیچھے ہٹا آگے بڑھ گیا۔

زرد اور خاکستری رنگ کے پتھروں کی جس دیوار پر جا کر یہ گلی ختم ہوتی تھی وہ مسجد قرطبہ کی فصیل تھی۔ گلی کے دہانے پر پہنچ کر میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ نگاہ دوڑائی تو میری آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا اور مجھ پر کچھ ویسی رقت سی طاری ہو گئی جو نانی ماں پر فلمی طرز کی نعتیں سن کر طاری ہو جایا کرتی تھی۔ میں نے ایک جھرجھری لی، شانے جھٹکے اور ایک منجھے ہوئے ٹورسٹ کی طرح اپنے آپ سے انگریزی میں

کہا تو یہ ہے مسلمانوں کا وہ عبادت کدہ جس کی تعمیر انہوں نے آٹھویں صدی میں شروع کی تھی۔ اچھی خاصی عالیشان عمارت ہے!" مگر یہ فقرہ مجھے ٹھیک سے سہارا نہ دے سکا اور میں یہ دیکھ کر دکھی ہو گیا کہ اس عمارت کی اچھی طرح نگہداشت کیوں نہیں ہوتی۔ اس کی شکست و ریخت پر کوئی توجہ کیوں نہیں دیتا۔ سیڑھیاں کیوں ٹوٹ گئی ہیں۔ کنگرے کیسے ڈھے گئے ہیں۔ ڈاٹوں کے پتھر اندر کو کیوں پچک گئے ہیں۔ کرسی کے اوپر دیوار کو شورہ چاٹ رہا ہے تو دنیا کے کسی عبدالرحمان کو خبر کیوں نہیں ہوتی؟ ۔ لاحول ولاقوۃ' میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا ابھی انسان کو اپنے جذبات کی تادیب کے لیے کتنے سالوں کتنی صدیوں کی ضرورت ہے۔ مذہب کا جنازہ نکل چکا۔ دھرم کی تردید۔ پٹ چکیں۔ وقت کے تقاضے بدل گئے لیکن میں پڑھ لکھ کر بھی رجعت پسند ہی رہا، لاحول ولاقوۃ۔

المینار پر حضرت عیسیٰ کا مجسمہ چمک رہا تھا۔ میں نے نفرانی تحمل کے ساتھ اس کی طرف دیکھا، اس سے نیچے کانسی کے بڑے بڑے گھنٹے لٹک رہے تھے اور ان کی لٹھ کے ساتھ فولادی رسے کا سرا بٹ کیا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ پتھر کے دو پرنالوں کے سوا باقی سب ٹوٹے ہوئے تھے اور ان کے موکھوں میں زنگ آلود ٹین ٹیڑھا میڑھا کر کے پھنسایا ہوا تھا۔

مسلسل بارشوں سے کنگرے اور منڈیریں سیاہ ہو چکی تھیں اور ادھر ادھر پھپھوندی کی دبیز تہیں دیوار سے چمٹ رہی تھیں۔ میں حوصلہ کر کے آگے بڑھا اور اونچی دیوار کے قدموں میں کھڑے ہو کر لامرکیتا پر اپنے دونوں ہاتھ یوں رکھ دیے جیسے جوگیا بانا پہنے کھیت نے ماروی کو پکار پکار کر شاہ عمر کے حرم پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ماروی قید تھی شاہ عمر جابر تھا اور حرم کی دیواریں بہت ہی اونچی تھیں۔ میں نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا ان پر بھورے رنگ کے مہین مہین ذرے چمٹ گئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے یہ ذرے گالوں تک پہنچے، پلکوں سے لگے اور پھر ماتھے پر چپٹ کر رہ گئے ——— جب کبھی حیدرآباد میں میرا دادا بیمار پڑا ہو گا اس نے ضرور اسی طرح تیمم کر کے نماز ادا کی ہوگی ——— میں نے جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا اور بڑے چوبی دروازے سے اندر صحن میں داخل ہو گیا۔

چھوٹے قد کی دو موٹی عورتیں لیموں کے ایک سایہ دار پیڑ تلے بیٹھی گپیں ہانک رہی تھیں۔ ایک کے سامنے پرانے کپڑوں کی گٹھڑی رکھی تھی اور دوسری کی گود میں میلی کچیلی بڑی تقطیع کی بائیبل۔ اندر گرجے میں عبادت گزارنے کے بعد یہ چند منٹ سستانے یہاں بیٹھی ہوں گی اور پھر اڑوس پڑوس کی کہانیاں انہیں کہیں سے کہیں لے اڑی ہوں گی۔ سامنے باب النخیل کے پاس سرو کی دور افتادہ چھاؤں میں مسجد قرطبہ کا یا یوں کہیے گرجے کا محافظ کرسی ڈالے اخبار دیکھ رہا تھا۔ میں نے صحن میں پہنچ کر چاروں طرف نگاہ دوڑائی، لیموں کے پیڑ یتیم خانے کے مدرسے میں حمد کہنے والے بچوں کی طرح کھڑے تھے۔ سرو کا درخت بہت بلند تھا لیکن اس کی بلندی میں ایک طرح کی دست بستگی مضمر تھی جیسے وہ ہاتھ باندھ کر آسمان سے کچھ کہنا چاہتا ہو۔ کھجور کا تنا خمیدہ تھا اور اس کی چھدری ڈالیاں جگہ جگہ سے ٹوٹ ٹوٹ کر زمین کی جانب جھول گئی تھیں اور ان میں اب دم کا نشان تک نہ تھا۔

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا محافظ کی طرف بڑھا اور اس کے پاس جا کر رک گیا۔ اس نے عینک اتار کر میری طرف دیکھا اور انگریزی میں پوچھا "فرمائیے! میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

میں نے منفعل بچے کی طرح ضیلا جھلا کر کہا "میں مسجد دیکھنی چاہتا ہوں اور اگر اجازت ملے ....."

لیکن اس نے میرا فقرہ بیچ ہی میں کاٹ دیا اور اخبار کی تہ لگاتے ہوئے بولا "مسجد اس وقت بند ہے شام کے چار بجے کھلے گی اس وقت آئیے گا۔"

میں نے کہا "مسجد کے بھی کوئی اوقات ہوتے ہیں! یہ تو خدا کا گھر ہے۔ اسے تو ہمیشہ کھلے رہنا چاہیے۔"

محافظ ہنس پڑا اور ران پر اخبار کا پٹاخہ بجا کر بولا "کبھی مسجد بھی خدا کا گھر ہوتی ہے!"

میں سہم گیا اور باب النخیل کے اوپر ورجن میری اور بچے کی پلیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولا "یہ جو ہیں یہاں؟"

محافظ ایک مرتبہ پھر مسکرایا اور رازدارانہ لہجہ میں کہنے لگا "یہ تو عمارت کی ناپاکی دور کرنے اور پلید روحوں کو بھگانے کے لیے لگائی گئی ہے۔ ورنہ ان کا ٹھکانہ تو ہمارے دلوں میں ہے۔"

جان کتنی عزیز ہوتی ہے اور پھر پردیس میں مرنے کو تو کسی کا بھی جی نہیں چاہتا۔ میں نے بے معنی طریق پر سر ہلایا اور موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا "آپ یہاں کے محافظ ہیں؟"

اُس نے گھٹنے پر سے تین مرتبہ پھسل جانے والی پنڈلی کو کھجایا اور کہا "ہاں! میں بھی ایک محافظ ہوں اور دوسروں کی طرح یہاں کا گائیڈ بھی ہوں۔"

میں نے کہا "پھر تو آپ کے پاس چابیاں بھی ہوں گی۔ کھول کر دکھا ہی کیوں نہ دیجیے؟"

گائیڈ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا "حکم نہیں۔"

میں نے کہا "یہ حکم بھی عجیب مصیبت ہوتے ہیں مانو تو مرو نہ مانو تو سولی چڑھو۔"

اُس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ہولے سے کہا "کچھ نہ پوچھو۔ جو لمحہ خیریت سے گزر جائے وہی اچھا۔"

میں نے شہ پاکر آہستہ سے پوچھا "یہ درخت اُسی وقت کے ہیں یا بعد میں لگائے گئے ہیں؟"

"گائیڈ نے توبہ کرو جی" کے انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "اب تک رہ سکتے تھے وہ درخت! بعد میں کاشت کیے گئے ہیں لیکن اسی انداز میں اور اسی ترتیب سے۔ مثلاً اس صحن کو صحن نارنج کہتے ہیں۔ یہاں موروں کے زمانے میں لیموں اور سنگترے کے پودے ہوا کرتے تھے۔ اِدھر گرد سرو کے پیڑ تھے اور درمیان میں کھجور کے درخت، کھجور مسلمانوں کا متبرک درخت ہے نا اس لیے ہم نے بھی بڑی محنت سے ان درختوں کو پالا ہے۔"

میں نے کہا "تم لوگوں نے خواہ مخواہ اتنی مشقت کیوں کی۔ رہنے دیتے۔"

"ٹورسٹ پسند کرتے ہیں" گائیڈ نے تجارتی راز کھولا۔

"کوئی مسلمان ٹورسٹ بھی آتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کبھی کبھار آ ہی نکلتا ہے" گائیڈ نے لاپرواہی سے کہا "زیادہ تر مراکشی ہوتے ہیں۔"

"وہی جو یہاں سے بھاگ گئے تھے۔ میں نے کہا۔

"ہاں وہی جنہیں یہاں سے نکال دیا گیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا "ذرا دروازہ نہیں کھول دیتے میں ایک منٹ میں اندر جاکر سب کچھ دیکھ لوں گا۔"

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر بڑے دھیمے لہجہ میں کہا "کہہ جو دیا کہ حکم نہیں۔"

میں اس کے پاس ہری ہری گھاس پر بیٹھ گیا اور سامنے المینار کی طرف دیکھنے لگا جس پر حضرت عیسیٰ کا بت، ہاتھ میں آہنی عصا لئے چاروں طرف دیکھتا رہتا ہے کہ اس معبد پر کوئی آفت تو نہیں آرہی۔

وہ پھر اخبار پڑھنے لگ گیا تو مجھے اس کی بے توجہی پر بڑا غصہ آیا مگر تپتے ہو کر بھی کام نکلتا نظر نہ آتا تھا۔ میں نے آرام سے پوچھا "اتنے بڑے صحن میں وہ لوگ کرتے کیا تھے۔"

اس نے اخبار سے نگاہ ہٹائی اور کچھ استادوں کا کچھ گائیڈوں کا لہجہ لیے ہوئے کہا "یہاں وہ مؤذن کی آواز پر آہستہ آہستہ جمع ہوتے تھے اور عبادت کدے میں داخل ہونے سے پیشتر ہاتھ پاؤں دھوتے تھے۔ اُس وقت یہاں نہایت ہی خوبصورت حوض بنے ہوئے تھے جن کے کنارے مور جوتے اتار کر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے تھے اور ہاتھ منہ دھونے کی رسم ادا کرتے تھے۔ پھر وہ مسجد کے اندر فوجی انداز میں قطاریں باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور مکہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے۔ اُن کا پادری امام کہلاتا تھا جو سفید چوغہ اور سر پر سبز عمامہ پہن کر قرآن سے کچھ چیزیں پڑھتا تھا اور اُس کے پیچھے کھڑے ہونے والے اس کے حکم کے مطابق حرکت کرتے تھے۔ دراصل یہ عبادت نہ تھی فوجی پریڈ تھی اور ان لوگوں میں بڑا اتفاق تھا۔ عبادت کے بعد وہ لوگ پھر اسی صحن میں آجاتے اور مختلف گروہوں میں بٹ کر فلسفہ، قانون اور علم البیان پر مباحثے شروع کر دیتے۔ علم کی بنیادیں یونان میں رکھی گئیں وہ روما کے فورم میں پروان چڑھا اور قرطبہ کے صحن نارنج میں تکمیل کو پہنچا، اور سچی بات تو یہ ہے کہ موجودہ دنیا نے سائنس میں جتنی ترقی کی ہے وہ سب ہمارے ہسپانیہ کی بدولت ہے۔" اس نے مسجد کی دیوار پر حسرت کی ایک نظر ڈالی اور اخبار کا کونہ پھاڑ کر چبانے لگا۔

میں نے ذرا آگے بڑھ کر خوش ہو کے پوچھا "تو گویا مور اچھے تھے اور انہوں نے ۔ ۔ ۔ ۔؟"

"اچھے برے کا سوال نہیں" اس نے مجھے سمجھانے کی غرض

سے کہا" انہوں نے انسانیت پر جو احسان کیے ہیں دنیا کی، خاص طور پر یورپ کی کوئی قوم اس سے انکار نہیں کر سکتی" میں خوشی کے مارے دیوانہ ہو گیا اور ایک دم سروقد اُٹھ کھڑا ہوا۔ جی چاہا گائیڈ سے لپٹ کر اس کا منہ چوم لوں مگر ہمت نہ پڑی۔ جب وہ میری طرف برابر دیکھے گیا تو میں نے بائیں ہاتھ سے چھاتی بجا کر اور سر اُونچا کر کے کہا "میں بھی مور ہوں!"

"کیا؟" اُس کے ہاتھ سے اخبار گرتے گرتے بچا۔

"میں نے کہا میں بھی مور ہوں"

"یعنی تم مسلمان ہو" اس نے پوچھا۔

"ہاں" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا" یہ دیکھو۔۔۔۔ دیکھو یہ میرا شناختی کارڈ ہے۔۔۔۔۔ روم یونیورسٹی کا شناختی کارڈ۔ دیکھو میرا خاندانی نام احمد ہے۔ احمد موروں کا نام ہی ہوا کرتا ہے نا"

اس نے کارڈ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ساری عبارت کو غور سے پڑھا اور پھر دوستانہ لہجے میں پوچھا کہاں ٹھہرے ہو؟"

"پاتیو پانسی اون میں" میں نے فخر سے جواب دیا۔

"ہوں" اُس نے کارڈ واپس لوٹا دیا اور اخبار سے اپنی گردن کے پاس ہوا کرنے لگا۔ کچھ ایسی گرمی تو نہ تھی۔ میں نے شوخ بچے کی طرح مچل کر کہا "اب تو دروازہ کھول دو"

گائیڈ نے کہا "میرے پیارے بھائی مسجد چار بجے سے پہلے نہیں کھل سکتی۔ میں حکم کے ہاتھوں مجبور ہوں"

میں نے کہا "اچھا میں چار بجے ہی آجاؤں گا لیکن اب ذرا جھری میں سے جھانک کر اندر تو دیکھ لوں کہ سیاہ و سفید ٹکڑوں کی نعل ایسی محرابیں کیسے لگتی ہیں"

اس نے بڑی نرمی سے جواب دیا "اندر اندھیرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں"

"میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا" اس وقت میں اندر کا اندھیرا دیکھ کر ہی مطمئن ہو جاؤں گا۔ جھری میں سے ٹھنڈا ٹھنڈا سیلا سیلا اندھیرا میری سکھ گال کو تو لگ سکے گا مجھے اندر سے مسجد کی مخصوص لپٹ تو آئے گی میں سانس لیتے ہوئے۔۔۔۔"

اس نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "اگر تم کوشش کرو گے تو میں تمہیں دروازے سے نوچ کر یہاں صحن کی روش پر پھینک دوں گا" وہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا جیسے مجھے شہ دے رہا ہو کہ "آگے بڑھ کے تو دیکھو"

میں نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے قدرے زور سے کہا "اچھا میں چار بجے ہی آجاؤں گا۔ اُس وقت تو تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا"

"ہاں اگر میں ڈیوٹی پر نہ ہوا تو مجھے اعتراض نہ ہوگا"

میں اس کا یہ فقرہ سُن کر سناٹے میں آگیا اور کوئی اور بات کیے بغیر چوروں کی طرح آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا صحن سے باہر نکل گیا۔

مسجد کے پچھواڑے پرانی طرز کے ایک رومن دروازے سے گزر کر دریائے کبیر کا وہ حصہ ایک دم آنکھوں کے سامنے آگیا جہاں دختر دہقان گیت گایا کرتی تھیں۔ اس کہنہ پل پر جیسی طرز کا ایک بوڑھا آدمی مزے مزے اپنی خچر ہانکے جاتا تھا نیچے چابی دار محرابوں میں سے ہوتا ہوا دریائے کبیر کا گدلا گدلا پانی رواں تھا۔ پانی کے کم ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی ریتیاں مردہ کچھوؤں کی طرح پڑی تھیں اور ان پر گلے سڑے سرکنڈے اور جھاڑ جھنکاڑ کے اجڑے ہوئے گھونسلے پڑے تھے۔ مسجد کے عین پیچھے اُونچے اُونچے نرسلوں کے آس پاس سؤر چر رہے تھے اور اپنی غلیظ دمیں گھما گھما کر دائرے نیم دائرے اور سوالیہ نشان بنا رہے تھے۔ چار پانچ سؤر ایک سؤر کو نرسلوں سے کوڑے کے ڈھیر تک اور ڈھیر سے نرسلوں تک بھگائے پھرتے تھے۔ چونکہ مسجد کے دروازے بند ہیں، میں نے سوچا، اسی لیے دریائے وادی الکبیر کا منظر گھناؤنا ہو گیا ہے جونہی مقدس باب کھلیں گے ترنجن میں گانے والی دہقان لڑکیاں آپ سے آپ اس کے کناروں پر جمع ہو جائیں گی۔

صبح سے اب تک چلتا رہا تھا، تھک گیا تھا۔ جسے دیکھنے آیا تھا اس کے دروازے بند تھے، جہاں گیت سننے کی آرزو لے گئی تھی وہاں غلیظ صورتیں بھیانک آوازیں نکال رہی تھیں۔ سوچا چل کر پہلے سٹیشن سے اپنی گیس لے لوں۔ اس کے بعد پانسی اون میں آرام کروں اور پھر چار بجے کپڑے بدل کر مسجد دیکھنے آؤں۔ جس طرح شبنم کے نزول سے

کلیوں کے منہ دھل جاتے ہیں اور سبزہ نکھرتا ہے، اسی طرح چار بجے کے بعد قرطبہ میں جمال و جلال کے مظاہر آپ سے آپ جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ چار تو بجنے دو۔

جب میں سٹیشن سے بکس لے کر پانسی اون لوٹا تو ایزا بیلا ڈیوڑھی میں آئینہ کے سامنے اپنے بالوں کو برش کر رہی تھی۔ میرا عکس دیکھ کر وہ تیزی سے پلٹی اور امریکن انداز میں بڑی بے تکلفی سے 'ہیلو' کہہ کر میری طرف یوں دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو "جان تمنا صبح سے اب تک کہاں رہے ہو؟" میں خالص برطانوی طریق پر 'ہیلو' کہہ کر دہلیز کے پاس ٹھٹھک گیا اور سوچنے لگا کہ اس لڑکی کو قالو بلا کے علاوہ اور کہاں دیکھا ہے! ساتھ کے کمرے سے لینڈ لیڈی برآمد ہوئی اور اُس نے ہسپانوی میں لڑکی سے کچھ کہا۔ ایزا بیلا مسکرانے لگی اور گردن پر پڑے ہوئے سیاہ بالوں پر پلاسٹک کا برش پھیرتے ہوئی بولی میری امی کہتی ہے کہ میں نے آپ سے اپنا پورا تعارف کیوں نہیں کرایا؟

میں نے کہا "آپ کیا کہتی ہیں؟"

ایزا بیلا نے ہنستے ہوئے کہا "کچھ بھی نہیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں کہتی۔ میرا نام ایزا بیلا ہے اور ممی کی لڑکی ہوں۔ میڈرڈ کی ایک امریکی فرم میں ملازم ہوں اور ہر ویک اینڈ پر یہاں اپنے گھر آیا کرتی ہوں۔"

میں نے کہا "یہ سب کچھ تو مجھے ایک نظر دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا۔ کچھ اور بتائیے۔"

ایزا بیلا یوں ہنسی کہ اس کے گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے پیدا ہو گئے۔ ماں نے متجسس نگاہوں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے اپنی زبان میں پوچھا "یوں ہنس کیوں رہی ہو ایزا بیل؟"

لیکن ایزا بیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہنستی رہی اور برش کرتی رہی۔

ایزا بیلا نے سفید وائل کی آدھی سے کم آستینوں والی قمیص پہن رکھی تھی اور کالر پر ایک چھوٹا سا ونگ برابر پھول لگایا ہوا تھا۔ اس کا قد چھوٹا تھا لیکن گردن کچھ اس طرح کی تھی کہ مجھے گرمیوں کے اُس روزے کی یاد آ گئی جب میں نے پیاس سے مغلوب ہو کر ٹھنڈے پانی سے بھری ایک کوری صراحی پر ہونٹ رکھ دیے تھے۔ قمیص کی آستینیں اُس کے سفید ڈولوں میں اس طرح کھب گئی تھیں کہ نیلی نیلی رگیں پھڑکنے لگی تھیں۔ اگر اس کے بالوں سے تازہ شامپو کی بو نہ آتی تو سارا کمرا ایزا بیلا کی خوشبو سے بھر جاتا۔ یہ خوشبو بالکل ویسی تھی جیسے کارتوس چلنے کے بعد شکاری کے اردگرد سے آیا کرتی ہے۔ اُس کے پاؤں میں قرطبہ کے چمڑے کی نازک سی چپلی تھی جس کے فیتے اس نے پنجوں پر باندھنے کے بعد سفید سفید ٹخنوں کے گرد لپیٹ لیے تھے۔ تین چار روزہ باسی نیل پالش کی وجہ سے پاؤں کی انگلیاں پرانے ٹائپ رائٹر کے کی بورڈ کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ جب وہ برش کرتے ہوئے سر جھٹکتی تو یوں لگتا جیسے کہہ رہی ہو "تم چلو— چلو نا— میں ابھی آتی ہوں" میں نے کچھ کہنا چاہا تو ایزا بیلا نے ہاتھ روک کر کہا "چاہو تو کپڑے بدل لو۔ ہم باہر جا رہے ہیں۔"

"کون کون؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں اور تم۔ اور کون!" اس نے میری طرف حیرانی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں تو آج شام مسجد دیکھنے جا رہا ہوں۔ اس کے بعد اگر چاہو...."

مگر اس نے میری بات بیچ ہی میں کاٹ دی اور رجان کے سے انداز میں کہا "واہ کوئی شام کو بھی مسجد دیکھتا ہے! اندر اتنا اندھیرا ہوتا ہے کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا اور پھر اس مسجد...."

"لیکن میں جانا چاہتا ہوں نا ایزا بیلا" اب کے میں نے بات کاٹی۔

"پتہ نہیں ٹورسٹوں کو کھنڈروں سے اتنا پیار کیوں ہوتا ہے؟" ایزا بیلا نے حیران ہو کر کہا۔

میں نے کہا "میں صرف ٹورسٹ ہی نہیں ہوں کچھ اور بھی ہوں۔"

ایزا بیلا ہنس پڑی اور آنکھیں نچا کر بولی "اچھا تو آپ پادری بھی ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا۔"

"پادری تو خیر نہیں" میں نے شرافت سے جواب دیا "خدا کا بندہ ضرور ہوں۔"

"خدا کے بندوں کو تو پھر ضرور اُس کے بندوں کا ساتھ دینا

چاہیئے۔"

میں نے کہا" بات یہ ہے ایزابیلا کہ میں ہر حال میں آج ہی مسجد دیکھنی چاہتا ہوں"۔

اُس نے اسی لہجہ میں جواب دیا" بات یہ ہے موسیو کہ میں ہر حال میں آج ہی بل فائیٹ دیکھنا چاہتی ہوں"۔

"لیکن میں نہیں چاہتا"۔ میں نے ادب سے جواب دیا۔

"ڈرتے ہو؟" ایزابیلا نے پوچھا۔

"مور ڈرا نہیں کرتے"۔ میں نے فخر سے جواب دیا۔

"مور!" وہ ہنس پڑی اور اپنی ہتھیلی میری طرف کر کے یقین دلاتے ہوئے بولی "ٹکٹ میں خرید رہی ہوں گھبراؤ نہیں"۔

"یہ موروں کی مہمان نوازی کو للکار رہے"۔ میں نے تیزی سے کہا "میرے ہوتے ہوئے تمہیں ٹکٹ خریدنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا"۔

"تو چلو پھر" اس نے بے تاب ہو کر کہا۔

"ٹھہرو، میں کپڑے بدل کر آتا ہوں"۔

جب ہم ہوٹل رہجینا کے قریب ایک قہوہ خانے سے کافی پی کر نکلے ساڑھے چار بج چکے تھے اور لوگوں کے گروہ بل فائیٹ دیکھنے جا رہے تھے۔ سڑک عبور کرتے ہوئے میں نے اس گلی کو پہچان لیا جو مسجد کی طرف جاتی تھی۔ "اس وقت جامع قرطبہ کے سارے دروازے کھل چکے ہوں گے" میں نے سوچا اور ایزابیلا کی کہنی تھامے، اُس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

تماشا گاہ پرانی طرز کی تھی اور اس کے منتظمین کی وردیاں ایسی خوبصورت اور صاف ستھری نہ تھیں جیسے میڈرڈ کے 'پلازادی تورو' کی ہیں۔ بکنگ آفس پر بھی کچھ ایسی بھیڑ نہ تھی اور ہمیں ذرا سی بھی زحمت اٹھائے بغیر ٹکٹیں مل گئیں۔ گیٹ کیپر کے قریب ایزابیلا نے تکیوں کے ڈھیر میں سے دو مقابلتاً صاف تکیے اٹھائے اور مجھے تھما کر آگے آگے چلنے لگی۔ اندر اور بھی بہت سی عورتیں اور لڑکیاں داخل ہو رہی تھیں لیکن نظرباز قسم کے قرطبی جس شوق اور خلوص سے ایزابیلا کی پنڈلیاں دیکھ رہے تھے وہ میرا سر فخر سے اُونچا رکھنے کے لیے کافی تھا۔ گو میرے قدموں میں بجلی کی سی تیزی نہ تھی لیکن تنی ہوئی گردن صاف بتا رہی تھی کہ کوئی "بہادر بل اکھاڑے میں داخل ہو رہا ہے۔

ہم نے بینڈ بجانے والوں کے عین سامنے جگہ منتخب کی اور گیلری پر اپنے اپنے تکیے رکھ کر بیٹھ گئے۔ پانچ بجنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے اور اکھاڑے کے اندر چھوٹے چھوٹے لڑکے نئی فلم کے اشتہار بورڈ گلے میں لٹکائے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ چوبی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک بڑی سی بوتل چکر لگا رہی تھی اور اس میں ہسپانوی اور فرانسیسی میں لکھا تھا "ہمیشہ پابلوش اورنج سکواش پیا کریں" اچانک اس بوتل کی کھڑکی کا پٹ زمین پر گر گیا اور اس کے پیچھے سیاہ پھٹی پتلون میں لپٹی ہوئی گھٹنوں سے نیچے دو ٹانگیں نظر آنے لگیں۔ سب لوگ قہقہہ مار کر ہنس پڑے لیکن ان میں سب سے پیاری ہنسی ایزابیلا کی تھی جس کے بند ہونٹوں سے ایسی کومل سریں نکلی تھیں جیسے وائلن کے باریک تار پر گز نے اچٹتی سی رگڑ کھائی ہو۔ بوتل رکی، آدمی باہر نکلا اور زمین پر پڑا ہوا پٹ اٹھا کر پھر بوتل کے اندر داخل ہو گیا۔ کھڑکی اپنی جگہ پر جمی اور بوتل پھر گھومنے لگی۔

پورے پانچ بجے بگل بجا تماشا گاہ کا بڑا دروازہ کھلا اور دو گھڑ سوار اندر اکھاڑے میں داخل ہوئے۔ گھوڑوں کو ایک ساتھ قدم قدم چلاتے وہ صدر کی نشست کے سامنے آ کر رکے اور صدر سے سانڈوں کے طویلے کی چابیاں طلب کیں۔ صدر نے چابیوں کا گچھا ہوا میں اچھالا اور ایک گھڑ سوار نے اپنی ٹوپی آگے بڑھا کر چابیاں اس میں دبوچ لیں۔ دونوں واپس چلے گئے تو بینڈ ایک مرتبہ پھر بجا اور 'ماتادور' اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اکھاڑے میں داخل ہوئے۔ ان کے دونوں جانب نائبوں اور امدادی گروہ کے چست و چالاک نوجوان تھے۔ سرخ سنہرے نارنجی لباس میں ملبوس ماتادور اپنی سیاہ ٹوپیاں اُٹھا اُٹھا کر ہمیں سلام کر رہے تھے اور ہم جواب میں بڑے زور سے تالیاں پیٹ رہے تھے۔

مشکل سے یہ مختصر سا جلوس اکھاڑے سے واپس گیا ہو گا کہ بگل کی آواز پر سامنے کا چوبی پھاٹک کھلا اور تیزی سے کالا سیاہ دل بادل سانڈ بجلی کی طرح اکھاڑے میں داخل ہوا۔ اس کونے کی پلک کے سامنے اکھاڑے کے چست و چالاک نوجوان اپنے اپنے سرخ و نارنجی لبادے لے کر لکڑی کی مضبوط ٹٹیوں کی اوٹ میں دبک

گئے۔ سانڈ نے اگلے کھر سے اکھاڑے کی گیلی مٹی کو کھدیڑا تو تنی گردن کے پاس لا کر ایک جھٹکے کے ساتھ نوکیلے سینگوں سے فضا کو چیرا اور تماشائیوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک نوجوان بڑی صفائی سے ٹٹی کی آڑ سے برآمد ہوا، چھاتی کے آگے لبادہ جھٹکا اور ایک مہیب آواز نکالی۔ سانڈ بگولے کی مانند اس کی طرف لپکا۔ ایزابیلا نے گھٹنوں پر رکھے ہوئے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچیں اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ نوجوان بائیں پاؤں پر گھوما اور سانڈ موننٹم میں اس کے پہلو سے رگڑ کھاتا ہوا دور نکل گیا۔ دوسری کمین گاہ سے ایک اور جوان نکلا۔ ابھی اُس نے ٹھیک سے لبادہ جھٹکا بھی نہ تھا کہ سانڈ پہاڑی سے لڑھکتے ہوئے ایک بے ہنگم پتھر کی تیزی سے اس پر آ چڑھا۔ خدا جانے اس نے کیا حرکت کی کہ سانڈ تو آگے نکل گیا لیکن وہ اس کی چھل سے چاروں شانے چت زمین پر گرا۔ بل کے لوٹنے سے پیشتر تیسرے ساتھی نے ٹٹی کی اوٹ سے سرخ کپڑا لہرایا اور سانڈ نے آگے بڑھ کر لکڑی کے تختے میں اس زور سے ٹکر ماری جیسے کوئی فولادی گولہ آ کر لگا ہو۔ سرخ جھنڈی دکھانے والا دو تختوں کے درمیان بچ کر بچکتا بچا۔

سانڈ کی ہر یورش پر تماشائی اپنی اپنی نشستوں سے تین چار انچ اُوپر اٹھ جاتے اور بے اختیار "اولے!" پکارتے۔ ایزابیلا کا برا حال تھا۔ کبھی دانت بھینچتی، کبھی آنکھیں میچتی، کبھی مٹھیاں کستی اور کبھی میری طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتی۔

کوئی پانچ منٹ تک یہ کھیل جاری رہا۔ اس کے بعد دو گھڑ سوار نیزے لے کر اکھاڑے میں داخل ہوئے۔ ان کے گھوڑے مریل سے تھے اور ان پر گھٹنوں تک، کوئی پانچ چھ انچ موٹی مونج کی ٹاٹ جھول کی طرح لٹک رہی تھی۔ سواروں نے اپنی رانوں تک موٹے دل والی نمدی کا ایک خول چڑھا رکھا تھا اور سر پر سولا ہیٹ کی وضع کے فولادی کے ٹوپ اوڑھے ہوئے تھے۔ جونہی یہ اندر آ کر اکھاڑے کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہوئے سانڈ ان کی طرف لپکا اور سر کو پورے زور سے گھما کر گھوڑے پر وار کیا۔ مونج کے دبیز ٹاٹ سے سینگوں کی انیاں دور گھوڑے کے جسم تک نہ پہنچ سکیں اور ٹوپی والے تلنگے نے موقع غنیمت جان کر سانڈ کی کوہان میں اپنا نیزہ گڑو دیا۔ سانڈ اس زخم کی تاب نہ

لا کر تلملایا، گھوڑے کو چھوڑ کر اور سر پھرا کر زبان سے زخم چاٹنے کی کوشش کی مگر تھوتھنی کوہان تک نہ پہنچ سکی۔ پھر شاید اس خیال سے کہ اپنے زخم کا بدلہ دوسرے سوار سے لے گا وہ دوسرے گھوڑے کی طرف لپکا مگر وہاں بھی اس کے ساتھ یہی سلوک ہوا اور پہلے زخم میں ایک نیزہ اور لگنے کی وجہ سے کوہان کی چربی بھی دکھائی دینے لگی۔

بگل بجا، گھوڑے واپس چلے گئے اور چست و چالاک نوجوان اپنے اپنے لبادے لے کر پھر زخمی سانڈ کے ساتھ کھیلنے لگے۔ لیکن اب سانڈ میں وہ پہلی سی تندی اور تیزی نہ رہی تھی۔ حملہ کرتا ضرور تھا لیکن لبادہ جھٹکنے والے کے پہلو سے گزر کر اپنے زخم کو چاٹنے کی کوشش کرتا اور ایک دو چکر کھا جاتا۔

بگل پھر بجا اور چھریرے بدن کے تین اور جوان لڑکے ہاتھوں میں کوئی گز بھر لمبی لوہے کی سلاخیں لے کر اندر اکھاڑے میں کود آئے۔ یہ سلاخیں رنگ برنگے پتنگی کاغذوں سے منڈھی ہوئی تھیں اور ان کی نوکیں ڈھلتے سورج کی روشنی میں شیشے کی نلکیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اکھاڑے کے بیچوں بیچ دونوں سلاخوں کو فضا میں بلند کئے لڑکے نے سانڈ کو للکارا اور سانڈ اس بظاہر نہتے آدمی کو دیکھ کر نتھنوں سے دھواں چھوڑتا پوری رفتار سے اس کی طرف دوڑا۔ سانڈ کو خود سے کوئی چھ فٹ کے فاصلے پر دیکھ کر وہ کا پنجوں کے بل اُچھلا اور تالاب میں ڈائیو لگانے والوں کی طرح ہوا میں اپنی کمر کو ایک جھٹکا دیا۔ اور دونوں سلاخیں سانڈ کی زخمی کوہان میں گھونپ دیں۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ سانڈ اس کی رانوں میں سینگ دے کر لڑکے کو باہر گیلری کی طرف اچھال دے گا مگر نہ جانے اس نے کون سے سرکس میں نوکری کی تھی، دونوں ملی ہوئی ٹانگوں کو مچھلی کے دھڑ کی طرح گھمایا اور سانڈ کی پچھلی ٹانگوں کے پاس آ کودا۔ سانڈ دیوانہ وار اکھاڑے میں گھوم رہا تھا اور اس کی کوہان میں گھسی ہوئی آہنی سلاخوں کی جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ اس نے دو تین مرتبہ پھر تھوتھنی سے اس بلا کو نکالنے کی کوشش کی مگر فربہ گردن میں ایسی لچک نہ پیدا ہو سکی۔ جھنڈیاں گڑنے سے سانڈ پھر تند ہو گیا تھا اور آگے بڑھ کر اکھاڑے کے ہر آدمی پر حملہ کر رہا تھا اور ہر آدمی اپنے اپنے لبادے سے اُسے جھانسے دے رہا تھا۔ خون کی روانی اور پسینے کی یورش سے سانڈ کے کندھے اور گردن پوری طرح

جھیگے چلے تھے اور ان پر اس کے سموں کی دھول خاکستری تہ بن کر چمٹی جا رہی تھی۔ جب تینوں لڑکے باری باری اپنی جھنڈیاں گاڑ چکے تو سانڈ کو کھلانے والے اکھاڑے کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے اور ماتادور اندر داخل ہوا۔ اس کا لباس سب سے خوبصورت خالص ریشم کا تھا۔ سر پر سیاہ رنگ کی ٹوپی تھی اور پنڈلیوں پر گھٹنوں سے نیچے اس نے تنگ مہری کی پتلون کے پائنچے کالے ربن سے باندھے ہوئے تھے۔ پاؤں میں ساٹن کی ٹائی والی گرگابی تھی اور کندھوں پر آج کل کی لڑکیوں کا پہناوا پیلے رنگ کی ابریشمی کرتی تھی جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ماتادور نے دونوں پنجے جوڑ کر ایڑیاں اٹھائیں، اصیل مرغے کی طرح چھاتی پھلائی اور سرخ لبادے کو ہوا میں یوں پھرایا جیسے ماہی گیر دریا میں ٹاپہ پھینکتے ہیں۔ چو ترین میں بندھا ہوا سانڈ غصے اور کرب سے اس پر جھپٹا اور ماتادور نے جسم کی ہلکی سی جنبش سے اُسے اپنے پہلو سے صاف گزار دیا۔ ہم سب نے اُس کے ساتھ تالیاں بھی بجائیں اور ماتادور نے سر جھکا کر ہمارا شکریہ ادا کیا۔ ایزابیلا نے ایک چیخ مار کر اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا اور میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ سانڈ جو چند قدم پر ٹھٹک کر پھر حملہ کرنے کے لیے ماتادور کی طرف لپک چکا تھا صرف ایزابیلا کو دکھائی دیا تھا ہم تو مزے سے ماتادور کو سلام کرتے دیکھ رہے تھے۔ اس بے توجہی میں سانڈ کا ایک سینگ ماتادور کے کولہے پر لگا اور وہ اپنی ایڑی پر لٹو کی طرح گھوم گیا مگر گرا نہیں۔ میں نے ایزابیلا کا کندھا تھپکا اور آہستہ سے کہا "سینور ماتادور صحیح سالم ہے تم دیکھو تو سہی" اُس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں تو ماتادور سانڈ کو چک پھیریاں دے رہا تھا۔ بل اب اس کے بالکل قریب سے حملے کر رہا تھا اور وہ ہر مرتبہ اُسے اپنے پہلو سے گزارتے ہوئے کبھی اس کی گردن سہلا دیتا کبھی اس کے سینگوں پر ہاتھ لگا دیتا۔ تماشائی خوشی سے دیوانے ہو کر اُس کی ہمت اور فن کی داد دے رہے تھے۔ جب لوگ اس کھیل سے محظوظ ہو چکے تو ماتادور نے اُوپر بالکونی میں صدر کی طرف دیکھا اور تیغ آزمائی کی اجازت چاہی۔ اذن مل گیا تو ماتادور نے سرخ لبادے کے نیچے سے ایک چمکدار دودھاری تلوار نکالی اور سانڈ کے عین سامنے کھڑا ہو گیا۔ سانڈ نے اپنے دونوں اگلے کھر ایک ساتھ زمین پر مارے تو ماتادور نے ذرا ترچھے ہو کر آہنی پتروں کے عین درمیان پوری قوت کے ساتھ چمکتی ہوئی گزہ دی تلوار اس کی کوہان میں اُتار دی جو اس کے کندھوں کی ہڈیوں میں سے ہوتی ہوئی دل میں اُتر گئی۔

سانڈ نے ایک کربناک آواز نکالی اور اس کے نتھنوں سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ زبان باہر لٹک گئی اور گوبر سے اس کی دم اور پچھلی دونوں ٹانگیں لتھڑ گئیں۔ وہ تھوتھنی کے بل زمین پر گرا اور پشت کے بل پیلی مٹی پر تڑپا۔ تلوار دستے تک اس کے جسم میں دھنس گئی اور زندگی، طاقت اور حرکت سے بھرپور جسم دیکھتے دیکھتے مٹی کا تودا ہو کر رہ گیا۔ ہم نے منہ میں حلق تک انگلیاں گھسیڑ کر سیٹیاں بجائیں، نعرے بلند کیے، تالیاں پیٹیں، لیکن یہ سارا منظر دیکھ کر ایزابیلا دکھی سی ہو گئی اور گھٹنوں میں کانوں تک سر دبا کر ساکت ہو گئی۔ لوگ اپنی ٹوپیاں، کوٹ، شراب کی چھاگلیں اندر اکھاڑے میں پھینک رہے تھے۔ عورتیں اپنے جوڑوں سے پھول اُتار اُتار کر ماتادور پر گل پاشی کر رہی تھیں اور ایزابیلا ویسے ہی بے حس و حرکت گٹھڑی بنی ہوئی تھی۔

جب گھنگھرو چھنکاتی تین خچریں سانڈ کی خون پسینے اور گوبر میں لتھڑی ہوئی لاش کھینچنے کے لیے اکھاڑے میں لائی گئیں تو میں نے آہستہ سے ایزابیلا کی کمر پر ہاتھ رکھا اور ہولے سے کہا "دیکھو بہادر سانڈ کا جنازہ گھسٹنے لگا ہے" اُس نے نیم خوابی کے عالم میں سر اُوپر اُٹھایا اور بولی "چلو چلیں۔"

میں حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگا۔ اُس نے اپنا چھوٹا سا رومال پرس میں بند کیا اور پھر کہا "چلو چلیں۔"

میں نے اُس کا کندھا دباتے ہوئے کہا "مگر ابھی تو پانچ بل اور باقی ہیں۔"

اُس نے سیٹ سے اُٹھتے ہوئے جواب دیا "نہیں، ہم جا رہے ہیں۔"

میں اس کے فیصلے میں کوئی ترمیم نہ کر سکا اور چپ چاپ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تھیلا اُٹھایا اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک دہقانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تماشائیوں کے پاؤں میں راہ تلاش کرنے لگا۔ کچھ لوگوں نے جن میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی ہماری طرف نفرت اور طنز سے نگاہ کی اور بزدل، پھوہڑ، بے حوصلے کے الفاظ دہرا کر سرگوشی

کرنے لگے۔ میں آگے آگے راہ بناتا جا رہا تھا اور ایزابیلا میرے پیچھے لوگوں کے پاؤں روندتی ہوئی چلی آتی تھی۔

عمارت سے باہر نکل کر ہم کافی دور تک ایک دوسرے سے بات کیے بغیر چلتے رہے۔ میرا خیال ہے جس سڑک پر ہم چل رہے تھے یہ اسی بڑی سڑک میں جا کر ملتی تھی جہاں آج صبح چلتے چلتے میں نے ٹین کی چھتوں کو دور سے دریائے کبیر سمجھا تھا۔

ایک بڑے سے گھنے درخت تلے چند میز کرسیاں بے ترتیبی سے پڑی تھیں اور درخت کے تنے کے ساتھ لکڑی کا ایک چھوٹا سا قہوہ خانہ بنا ہوا تھا۔ ادھیڑ عمر کی ایک عورت اپنے اکلوتے گاہک کے لیے کافی تیار کر رہی تھی اور اس کا گاہک میز پر سر رکھے سو رہا تھا۔ چوبی قہوہ خانے کی عین پشت پر ہم دو کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے اور اپنے اپنے تھیلے میز پر ڈال دیے۔ ادھیڑ عمر کی عورت آئی اور آرڈر لے کر چلی گئی۔

ایزابیلا نے درخت کی ڈالیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جس طرح عیسیٰ مسیح ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سولی پر چڑھ گیا تھا اسی طرح سانڈ ہسپانیہ سے ہر بلا کو دور رکھنے کے لیے اپنا خون بہاتا ہے اور جب ہمارے ملک پر کوئی بہت ہی بڑی آفت آنے والی ہوتی ہے تو اکھاڑے میں کسی ماتادور کا خون بہتا ہے اور وہ اپنی قربانی سے ہم سب کی جانیں بچاتا ہے۔"

اس وقت دراصل نہ وہ مجھ سے بات کر رہی تھی نہ درخت کی ڈالیوں سے بلکہ وہ اپنے آپ کو سمجھا رہی تھی اپنے آپ کو یقین دلا رہی تھی کہ قربانی سے سب کچھ ہو سکتا ہے اور قربانی میں خون ضرور بہتا ہے۔

میں نے بڑے خلوص سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پشت دست کو تھپتھپاتے ہوئے بولا "ایزابیلا تم ایک دم اس طرح مغموم کیوں ہو گئی ہو؟"

اس نے شاید میری بات سنی نہیں اور اپنے آپ سے کہنے لگی "قرطبہ کے اسی اکھاڑے میں پالما کا بھورے رنگ کے وحشی بیل سے مقابلہ تھا اور اس بیل کی خصلتوں سے اصطبل کے نگہبانوں میں سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ ان دنوں پالما میری وجہ سے بہت ہی پریشان رہتا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ اکھاڑے میں اس کی پریشانی کہیں اس کی موت کی وجہ نہ بن جائے۔ لیکن میری احتیاط سے کیا ہو سکتا تھا بھلا۔

کچھ ایسی طاقتیں بھی ہیں جن کی وجہ سے اگر منظوری کا پروانہ نہ آئے تو انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تم ان طاقتوں کو مانتے ہو نا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو ایزابیلا میرے ہاتھ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی "فائی ایستا کے دن بلا کی تیز ہوا چل رہی تھی اور لڑکوں کے سرخ مولیتے ان کے گرد لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ میں گیلری میں پالما کے ساتھ لگی منہ ہی منہ میں دعائیں مانگ رہی تھی اور وہ مجھے تسلیاں دے رہا تھا۔ جب بھورا بیل اندر اکھاڑے میں داخل ہوا کسی کو ٹٹی کی اوٹ سے نکل کر مولیتا جھٹکنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے اور نتھنوں سے دھوئیں کے بھبھاکے نکل رہے تھے۔ وہ اگلے اور پچھلے کھروں سے جمی ہوئی مٹی اکھاڑ رہا تھا اور ہوا کی تیزی سے سارے اکھاڑے پر ایک بگولا سا ناچنے لگا تھا۔ اس بگولے کے پیچھے وہ دیوانگی کی حالت میں ناچتا ہوا بڑے زور سے ڈکرا رہا تھا اور پالما کے مددگار لکڑی کے تختوں کے پیچھے دبکے ہوئے تھے۔ خدا جانے پوسادا کو کیا سوجھی ہمت کر کے میدان میں آ گیا اور مولیتا کو تیزی سے جھٹک کر بیل کی طرف بڑھا۔ لیکن اس دن ہوا اس قدر تیز تھی کہ سانڈ کی موٹی مچھے دار دُم بھی بار بار اس کی کمر پر آ گرتی تھی پھر مولیتا کی کیا بساط تھی جو قابو میں رہتا۔ تیزی میں جو اڑا تو پوسادا کے چہرے اور کندھوں سے لپٹ گیا۔ اس نے سانڈ کی چاپ پر اپنا پہلو بدلا لیکن پھر بھی اس کی جھپٹ میں آ گیا اور زمین پر دور تک لڑھکنیاں کھاتا گیا۔ پالما نے جلدی سے آگے بڑھ کر لکڑی کی دیوار سے اپنا مولیتا اندر لٹکایا اور باہر کھڑے سانڈ کو للکارا۔ میں اس کے بازو سے چمٹی ہوئی تھی اور سانڈ آگے بڑھ بڑھ کر دیوار کو ٹکریں مار رہا تھا۔ دیوار پر اس کی ٹکر لگنے سے میں اور پالما گز بھر پیچھے تماشائیوں کی طرف لڑھک جاتے۔ اس دوران میں مددگار دستہ پوسادا کو اکھاڑے سے اٹھا کر لے گیا۔ جب اکھاڑا صاف ہو گیا اور بیل پھر اسی طرح کھروں سے خاک اڑانے لگا تو پالما نے آنکھ بچا کر اپنا مولیتا میرے سر پر پھینکا اور خود آہنی تیر اٹھا کر بجلی کی طرح اندر اکھاڑے میں کود گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور میں مایوس ہو کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ میں نے دیکھا نہیں لیکن

لوگ کہتے ہیں کہ جس صفائی سے پالما نے چھ کے چھ تیر سانڈ کی کوہان میں پرو دیے ہیں ویسے کوئی بیل کو بیڑ میں بیٹھ کر بھی نہیں گاڑ سکتا۔ پتہ ہے یہ سب میری دعاؤں کا نتیجہ تھا۔ جب پالما مولیتا لینے کے لیے باہر نکلا تو وہ سر سے پاؤں تک۔ پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ میں سرخ نارنجی مولیتا سینے سے لگائے ویسے ہی زمین پر بیٹھی تھی۔ پالما نے کپڑا میرے ہاتھ سے کھینچا تو میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پاس کھڑے ہوئے خدمتگار کو پانی لانے کے لیے کہا۔ یک تماشائی نے شراب سے بھری ہوئی چھاگل میرے پاؤں میں پھینک دی۔ میں نے تسمہ کھولا اور مولیتا کے دامن پر ساری چھاگل انڈیل دی۔ پھر مٹی کی مٹھیاں بھر بھر کر دامن پر ڈالیں۔ انگوری شراب کے کیچڑ سے دامن بھر گیا اور مولیتا کا نچلا حصہ کافی بھاری ہو گیا۔ پالما نے مجھے بوسہ دیا، صلیب کا نشان بنایا اور اکھاڑے میں کود گیا۔ اب۔ کے میں بیٹھی نہیں بلکہ بڑے حوصلے کے ساتھ چوبی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی رہی۔ تند ہوا مولیتا کو اڑاتی تھی مگر دامن بوجھل ہونے کے باعث وہ اتنا اونچا نہ اڑ سکتا تھا کہ پالما کے کندھوں پر پٹ جاتا۔ اس نے وحشی بل کو ایسے ایسے جھانسے دیے کہ صدر اور اس کے ساتھی بھی چیخ چیخ کر داد دینے لگے۔ بل کو اپنی طرف بلا کر وہ اس خوبصورتی سے مولیتا اپنی کمر کے گرد لپیٹتا کہ اندلوسیا کی کوئی رقاصہ لہنگا اڑاتی ہوئی رقص کرتی دکھائی دیتی۔ بل اس کے پہلو سے گھستا ہوا گزر جاتا۔ تماشائی اولے پکارتے اور میں خوشی سے آنکھیں بند کر لیتی۔

بگل کی آواز پر پالما نے دونوں ہاتھ پھیلا کر صدر سے تلوار گھونپنے کی اجازت طلب کی۔ ابھی صدر نے اشارہ نہ کیا تھا کہ بل کنی کاٹ کر اس پر ٹوٹ پڑا اور تھوتھنی زمین سے لگا کر پالما کے پہلو میں اس زور سے ٹکر ماری کہ وہ ہوا میں دس بارہ فٹ اوپر اچھل گیا اور پھر جو گرا تو اٹھ نہ سکا۔ اس کے شاگرد اوٹ سے نکل کر بل کو جھانسے دینے لگے اور وہ ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پالما نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا سر پھر زمین پر گر گیا۔"

"مر گیا؟" میں نے سانس روک کر پوچھا۔

"تمہارے منہ میں خاک" ایزابیلا نے ہاتھ کھینچ کر کہا۔

"خدا نہ کرے پالما کو کبھی بھی کچھ ہو!" ایزابیلا کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں لکڑی کی دیوار سے لگی پوری طاقت کے ساتھ چلائی اٹھو پالما۔ اٹھو۔ تمہیں اس بل کو ختم کرنا ہے۔ تمہارے سوا کوئی اسے مار نہ سکے گا۔ اٹھو پالما۔ اٹھو۔ تمہیں میں کہتی ہوں اٹھو۔ میری آواز سن کر پالما یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ جب اس نے اپنے دونوں قدم زمین پر جما کر تلوار ہوا میں لہرائی تو اس کی ران پر خون کی ایک تیز دھار بہہ نکلی۔ وہ لنگڑاتا ہوا بل کی طرف بڑھا اور بھوکے درندے کی طرح تلوار سونت کر اس پر پل پڑا۔ بازو کی ایک ماہرانہ حرکت سے تلوار بھورا چمڑا کاٹتی دستے تک بل کے اندر دھنس گئی۔ بل نے اچھلنے کی کوشش کی مگر اچھل نہ سکا۔ پالما نے ایک طرف ہٹنے کی کوشش کی مگر ہٹ نہ سکا اور قاتل و مقتول دونوں پہلو بہ پہلو خون سے رنگی ہوئی زمین پر لیٹ گئے۔

"پھر؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"پھر!" ایزابیلا نے بڑے تحمل سے کہا" پالما نے میڈرڈ کی ایک ڈاکٹر سے شادی کر لی اور قرطبہ چھوڑ کر میڈرڈ میں آباد ہو گیا۔"

"اور تم..... تم....." میں نے رکتے ہوئے کہا" تم پالما سے نہ مل سکیں"۔

"نہیں" ایزابیلا نے ناخن سے میز کو کھرچتے ہوئے کہا" پھر پالما مجھ سے ملا ہی نہیں اور میں میڈرڈ کے پلازا میں کبھی بل فائٹ دیکھنے گئی ہی نہیں۔ میری ممی نے کہا محبت کے سلسلے میں ہم سے کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ضرور ہو جاتی ہے جبھی تو ہم کسی کے دل کے سنگھاسن پر جگہ نہیں پا سکتیں۔ میرے پیدا ہونے میں تین ماہ باقی تھے کہ میرا باپ میری ماں کو چھوڑ کر ایک فرانسیسی عورت کے ساتھ پیرانیز کے پہاڑوں کے اس طرف جا کر آباد ہو گیا اور لوٹ کر نہ آیا!"

میں نے ایزابیلا کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اس نے اپنا گال میرے بازو پر رکھ دیا۔ میں نے کہا" محبت کے میدان میں کسی بھی کھلاڑی کا بس نہیں چلتا۔ جب اوپر سے ایک پروانہ مہر لگ کر آ جاتا ہے تو کھیل کا فیصلہ خود بخود ہو جاتا ہے اور یہ ضروری نہیں ہوتا کہ فیصلہ اسی کے حق میں ہو جس نے زیادہ تپسیا کی تھی۔" ایزابیلا

نے جیسے نیند میں ڈوبے ہوئے پوچھا "مگر ایسا کیوں ہوتا ہے"۔
میں نے اُس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں تمہیں کیا بتاؤں مجھے تو بس اسی قدر معلوم ہے کہ :

عین عشق دریا دی جبدیں لہر مگے پئی تندیاں کرماں والڑیاں
کئی کو ہجیاں لنگھ پارگیاں تے ڈب موئیاں شرماں والڑیاں
اک سوہنیاں دے مستے بھاگ ناہیں باہروں لال تے اندروں کالیاں
یار فرید جے چاکرم کرے عیباں والیاں دے مستے لاڑیاں

ایزابیلا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور مجھ سے اس کا مطلب پوچھنے لگی۔ میں نے بمشکل تمام اس کا مفہوم سمجھایا تو شاعر کا پورا نام اور اس کی زندگی کے حالات پوچھنے لگی۔ میں نے بتایا کہ جو درجہ عیسائیوں کی نظر میں آسیسی کے سان فرنچیسکو کا ہے وہی غلام فرید کا ہمارے یہاں ہے۔ ایزابیلا نے غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "ہمارے یہاں سے تمہاری کیا مراد ہے"؟

"ہمارے یہاں" میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "ہمارے موروں کے یہاں، ہمارے مسلمانوں کے یہاں"۔

ایزابیلا کو ایک ثانیہ کے لیے دھکا سا لگا پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور آنکھیں نچاتے ہوئے بولی "سچ سچ تم شکل سے مور ہی دکھائی دیتے ہو"۔

"شکل ہی سے نہیں"، میں نے حوصلہ کر کے کہا "دل سے بھی ہوں"۔

"نہیں" وہ زور سے چیخی۔

"سچ" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"میری قسم کھاؤ" ایزابیلا نے دردناک آواز میں کہا۔

"تمہاری قسم!"

اُس نے اپنی دونوں مٹھیاں بھینچ کر زور سے میرے کندھوں پر ماریں اور اپنا سر میری چھاتی پر رکھ دیا اور روتے ہوئے کراہنے لگی نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم مسلمان نہیں ہو۔ تمہاری باتوں میں اتنی مٹھاس ہے، تمہاری گرفت میں اتنا خلوص ہے۔ تمہاری آنکھوں میں ایسی محبت جھلک رہی ہے کہ تم مسلمان ہو ہی نہیں سکتے۔ مور کہلا ہی نہیں سکتے"۔ پھر اُس نے میری گردن کے گرد بازو ڈال کر اپنے آپ سے کہا "نہیں نہیں ضرور مجھ سے کوئی چوک ہوئی ہے ورنہ تم مسلمان نہ ہوتے"۔

ہوا سے اُس کے بالوں کی تاریں میرے چہرے پر گئیں تو میں نے گرفت مضبوط کر کے کہا "میں تو مذہب وذہب میں ذرا بھی اعتقاد نہیں رکھتا۔ خواہ مخواہ خون بہانے کے لیے پناہیں بنا رکھی ہیں۔ میرے ماں باپ البتہ مسلمان ہیں"۔

"اور دادا دادی"؟ اس نے ہولے سے پوچھا۔

"وہ بھی مسلمان تھے"، میں نے خفیف ہو کر کہا۔

"تو پھر تم یہاں کیا لینے آئے ہو"؟ ایزابیلا نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"تم سے ملنے۔ اپنے رشتہ داروں سے ملنے، اپنے عزیزوں ...."

ایزابیلا پھر سنبھل گئی اور بات کاٹ کر بولی "ہم سے کیوں"؟

میں نے کہا "اس لیے کہ تم ہمارے ہی تو ہو۔ ہم ہی سے تو ہو۔ ہمیں تو ہو"!

وہ ٹکٹکی میری طرف دیکھے جاتی تھی اور میں عین اسی کے انداز میں کہہ رہا تھا "اگر تم یہاں نہ ہوتے، اگر یہ مسجد اس جگہ نہ ہوتی۔ اور اگر تم اپنے آپ کو ہسپانوی کے بجائے فخر سے اندلسی نہ کہلواتے تو پھر میں یہاں کیوں آتا بھلا! ایزابیلا نے ایک طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "تو یہ مسجد تمہاری ہے"؟

میں نے کہا "ہم دونوں کی ہے۔ اس لیے کہ ہم ایک ہیں"۔

ایزابیلا نے پوچھا "تو قرطبہ میں تم صرف یہ مسجد دیکھنے آئے ہو"؟

میں نے کہا "میں خود نہیں آیا۔ بلوایا گیا ہوں۔ یہاں ہمارے شاہ عنایت صاحب رہتے ہیں اور ٹھیل پکڑنے والوں کی طرح ہمارے دلوں پر کنڈیاں ڈال کر بیٹھے ہیں جس کو چاہتے ہیں کھینچ کر پاس بلا لیتے ہیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا"۔

ایزابیلا حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگی اور پھر میز سے اپنا پرس اٹھا کر اپنے آپ سے بولی "کہیں نہ کہیں پھر غلطی ہوئی ہے"۔

وہ اُٹھ کر چل دی تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا اور بل فائٹ کے پلازا سے لے کر یہاں تک ہم جس خاموشی کے ساتھ اکھٹے آئے تھے ویسے ہی واپس چلتے رہے۔ بڑے چوک پر اُس نے رک کر پوچھا "سینما چلو گے"؟

میں نے انکساری کے ساتھ کہا "سخت تھکا ہوا ہوں اور گزشتہ رات بھر کے رت جگے سے میری آنکھیں مچی جا رہی ہیں۔ پھر صبح سویرے مجھے مسجد دیکھنے بھی جانا ہے۔ آج نہیں، کل چلیں گے۔"

ایزابیلا نے اطمینان سے کہا "جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن میں تو فلم دیکھ کر گھر آؤں گی۔ تم سونا چاہتے ہو تو سیدھے یہیں سے گھر چلے جاؤ۔ راستہ معلوم ہے نا؟"

میں نے کہا "ہاں یہاں سے تو آسان ہی ہے۔"

ایزابیلا مسکرائی اور مجھے چوراہے کے بیچ چھوڑ کر دوسری طرف مڑ گئی۔

اُس رات مجھے بس اسی قدر یاد ہے کہ پانسی اوں پہنچ کر میں نے ایک رکابی شوربہ پیا۔ دانت صاف کئے اور بستر کے ساتھ لگتے ہی گہری نیند سو گیا۔ شاید میں دن چڑھے کب تک اسی طرح جوانی کی نیند سویا رہتا اگر پانسی اوں کی مالکہ مجھے جھنجھوڑ کر جگا نہ دیتی۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے اُس کا شکریہ ادا کیا اور بچوں کی طرح منہ سے جماہی مارتے ہوئے تکیے کے نیچے سے ٹٹول کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ میں نے ابھی سگریٹ سلگایا ہی تھا اور دیا سلائی کی روشنی میں گھڑی دیکھ رہا تھا کہ ترشی ہوئی مونچھوں والا ایک لمبا تڑنگا جوان میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اُس نے مسکرا کر مجھے خالص اندلسی انداز میں صبح بخیر کیا اور کرسی کھینچ کر میرے پاس بیٹھ گیا۔ جب اُس نے میرے کمرے میں اس طرح داخل ہونے پر معذرت طلب کی تو مجھے پتہ چلا کہ وہ ضرورت کے مطابق تھوڑی بہت انگریزی بول سکتا ہے۔ میں نے سگریٹ پیش کی اُس نے شکریہ کے ساتھ لوٹا دی اور پائپ نکال کر پینے لگا۔ بجھی ہوئی دیا سلائی کان میں پھیر کر بولا:

"سینور اب غرناطہ جائیں گے؟"

میں نے کہا "ہاں! لیکن ابھی میں چند دن آپ کے قرطبہ میں اور قیام کروں گا کیونکہ مجھے مسجد اور مدینۃ الزہرا کی سیر کرنا ہے۔"

اُس نے بڑی شائستگی سے جواب دیا "مجھے افسوس ہے سینور کہ آپ یہاں قیام نہ کر سکیں گے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے کمرے کی بتی بجھ گئی ہو۔

اُس نے مسکرا کر مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا "غرناطہ والی لاری چلنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو اس میں سوار کرا کے آؤں!"

"کس نے آپ کو ایسا احمقانہ حکم دیا ہے!" میں نے چیخ کر پوچھا۔

"محکمے نے" اُس نے اپنے کوٹ کا کالر اُلٹا اور اس کے نیچے مجھے ہسپانیہ کا سرکاری نشان پیتل کے بیضوی ٹکڑے پر کندہ دکھائی دیا۔

اُس نے اپنے پائپ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا "مجھے بے حد افسوس ہے کہ ہم آپ کی میزبانی نہ کر سکے۔ حکم کے آگے کس کا بس چلتا ہے بھلا!"

"اور اگر میں آپ کا حکم نہ مانوں تو" میں نے پوچھا۔

"پھر آپ کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اور میرا خیال نہیں کہ آپ ...." اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا اور مالکہ کو آواز دے کر پوچھا "کافی تیار ہو گئی کیا؟"

باورچی خانے سے مالکہ کی آواز سنائی دی اور وہ ناشتے کی ٹرے لے کر میرے کمرے میں پہنچ گئی۔ کافی پیتے ہوئے میں نے یونہی اپنی نبض پر انگلی رکھی تو مجھے ایسا لگا جیسے زندگی، حرکت اور امنگوں سے بھرپور تنومند سانڈ کو تیروں اور تلواروں سے ٹھنڈا کر کے جیت، وہ بانکے نوجوان اپنی اپنی کمین گاہوں میں واپس چلے گئے ہوں اور اب گھنگھرو چھنکاتی خچر اُس کی لاش گھسیٹنے آئی ہو۔ میں سفر کی تیاری کچھ اس خلوص اور دیانتداری سے کر رہا تھا جیسے میں نے ہی سی آئی ڈی کے اس ملازم کو اپنے نکالنے کے احکامات دیئے ہوں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے قرطبہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہو اس میں کھپریل والی ایک چھوٹی سی مسجد کے مٹتے ہوئے سے آثار ہوں یہاں ایک برساتی نالہ سا بہتا ہو اور پیرس یا روم کی طرح کی یہاں کوئی قابل دید چیز موجود نہ ہو۔

ٹائی بندھ چکی تو میں پانسی اوں کا بل ادا کر کے چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اہلکار نے آگے بڑھ کر میرا تھیلا پکڑ لیا اور دروازے کا پٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

"خوش بختی! خوش وقتی! خیریت۔ کا سفر" مالکہ نے دعا دی۔

"خوش بختی! خوش وقتی، سلامتی اور سکون" میں نے جواب میں کہا اور ایزابیلا کو دیکھے بغیر اہلکار کے ساتھ پانسی اوں کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

جب ڈرائیور نے لاری کا سلف دبایا تو میں نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔ پورے چوبیس گھنٹے پیشتر بالکل اسی وقت صبح کاذب کا سماں تھا اور ہماری گاڑی قرطبہ کے سٹیشن پر آ کر لگی تھی۔ عین اسی وقت ہمارے ڈبے کے پادری اور دونوں عورتوں نے مجھے دعا دی تھی۔ ایک قلی میرا سامان لے کر چلتا بنا تھا۔ باقی کے دو میرے بازو تھام کر زور آزمائی کرنے لگے تھے اور قرطبہ کے سٹیشن پر مختصر سی طاقت کے چھوٹے سے بلب کا فلامنٹ تمتما تمتما کر عاجز آ گیا تھا جب ہماری لاری بڑی سڑک پر چڑھنے کے لیے مڑی تو فیردی نانڈو چھپر کے پاس جھاڑو دے رہا تھا اور کوکلے تلنے والی لڑکی ابھی نہ آئی تھی۔ میں نے بڑی سڑک کے دونوں کناروں پر کھجوروں کی ڈالیوں میں سے صبح کاذب کی دلکشی دیکھنے کو نظریں جمائیں تو جامع قرطبہ کے کلیسا سے گجر کی پکار بلند ہوئی۔ مسجد کے منار بلند میں کانسی کا ڈرتا ہوا گھڑیال جب ہماری لاری کی طرف منہ کرتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے اپنی طرف بلا رہا ہو۔ اور جب آہنی رسّہ کی کھینچ اس کا منہ دوسری طرف موڑ دیتی تو ایسے لگتا جیسے گاؤں والے کسی ٹیلے پر چڑھ کر قافلے والوں کو الوداع کہہ رہے ہوں۔

سورج طلوع ہونے سے ذرا پہلے قرمزی رنگ کی روشنی آسمان کے مشرقی کنارے پر پھیلنے لگی تھی اور عرش منور سے بانگ کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔

لاری پہاڑی راستوں سے بل کھاتی ہوئی قرطبہ سے دور ہو رہی تھی کبھی پادری کا ہاتھ آہنی رسّہ نہیں کھینچ رہا تھا بلکہ شاہ عنایت نے بلھے شاہ کو اپنے حضور سے دھتکار کر پھر ڈور کھینچنا شروع کر دی تھی۔ عشق کے سلسلے میں بلھے پھر کسی سے کہیں کوئی غلطی ہو گئی تھی۔

Ref. No........ Date_____________197

قدرت اللہ شہاب

تُو ابھی رہگزر میں ہے

سعودی عرب کا نام سُن کر امریکن ایکسپریس کا منیجر کچھ سوچ میں پڑ گیا۔

ہالینڈ کے دارالخلافہ 'دی ہیگ' میں سفری انتظامات کرنے والے جتنے ادارے تھے اُن میں امریکن ایکسپریس کا کام سب سے زیادہ وسیع اور قابلِ اعتماد سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ہر وقت ایسے سیاحوں کا تانتا بندھا رہتا تھا جو کم سے کم وقت میں لمبے سے لمبا سفر کرنے کے خواہش مند تھے۔ یہ سفر عموماً دنیا کی جانی پہچانی شاہراہوں پر ہوتے تھے اور ان سیاحتوں کے سنگ ہائے میل نیویارک، لندن، پیرس، جنیوا، روم جیسے شہروں میں ہوا کرتے تھے۔ اس قسم کا سفر کس قدر طویل اور کس قدر پیچیدہ ہی کیوں نہ ہو، امریکن ایکسپریس کے بحری، بری اور ہوائی شعبوں کے ماہرین دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ساری تفصیلات تیار کر دیتے تھے۔ ریل اور جہاز کے ٹکٹ، چلنے اور ٹھہرنے کے اوقات نامے، ہوٹلوں کے پتے اور کرائے، ملازموں کو بخشش دینے کے آداب، قابل دید مقامات کی تفصیلیں، رقص گاہوں اور نائٹ کلبوں کے ٹیلیفون نمبر۔

امریکن ایکسپریس کے ہال میں پہنچ کر سب سے پہلے میرا سامنا انکوائری آفس کی ایک لڑکی سے ہوا۔ اُس نے خالص ڈچ انداز میں اپنی گردن کو لوچ دے کر امریکن لہجے میں میرا استقبال کیا: "گڈ مارننگ، سر۔ کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتی ہوں؟"

"شکریہ۔" میں نے کہا "میں سعودی عرب جانا چاہتا ہوں۔ اس سفر کے متعلق مجھے آپ کے کس شعبہ سے معلومات حاصل ہو سکیں گی؟"

"ساعودی عیرے بی آ..... ساعو عودی عیرے بی..... بی یا... یا....." لڑکی نے کئی بار زیر لب گنگنایا، اور پھر اپنے ڈچ شانوں کو امریکن انداز میں سکیڑ کر میری طرف یوں حیرت سے دیکھنے لگی جیسے میں نے اُس سے چاند کی سیاحت کے بارے میں کوئی سوال پوچھ لیا ہے۔

کچھ دیر اور گنگنانے اور کندھوں کو نیم ہیضوی جنبش دینے کے بعد آخر وہ مجھے اپنے ہوائی شعبے کے ماہر کے پاس لے گئی۔ سعودی عرب کا نام سُن کر ہوائی شعبے کے ماہر نے مجھے کن انکھیوں سے گھورا، پھر نہایت خوش اخلاقی کے ساتھ مجھے بحری شعبے کے حوالے کر دیا۔ بحری شعبے والے نے مجھے بری محکمہ میں بھیج دیا، اور بری شعبے کا ماہر کچھ دیر اپنا سر کھجلانے کے بعد مجھے اپنے منیجر کے پاس لے گیا۔

سعودی عرب کا نام سن کر منیجر بھی کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پہلے اُس نے اپنے میز کی دراز سے اٹلس نکال کر مشرق وسطیٰ کے نقشوں کا مطالعہ کیا۔ پھر اُٹھ کر سامنے والی دیوار پر لٹکے ہوئے چارٹ کا جائزہ لینے لگا جس میں ساری دنیا کے بحری، بری اور ہوائی راستوں کے مفصل خاکے بنے ہوئے تھے۔ میں نے اس نقشے میں جدہ، مکہ، مدینہ پر انگلی رکھ کے منیجر سے کہا، کہ اگر میں ان تین شہروں میں سے کسی ایک جگہ بھی پہنچ جاؤں تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔

منیجر نے اپنی سرخ جھنڈیوں والے تین پن اُٹھا کر ان مقامات پر نشاندہی کے طور پر لگا دیے۔

دنیا بھر میں مشرق سے مغرب، شمال سے جنوب تک ہر قسم کے سفری راستوں کے بے شمار جال بچھے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ شاہراہیں بغداد اور بصرہ، دمشق اور بیروت، قاہرہ اور پورٹ سعید جیسے ہوتی ہوئی آگے یا پیچھے، دائیں یا بائیں نکل جاتی ہیں۔ ان کے درمیان حجاز کی مقدس سرزمین ایک غیر مرئی جزیرے کی طرح الگ تھلگ پڑی رہ جاتی ہے۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے نام مسلمانوں کے دلوں پر تو بے شک خوب نقش ہیں، لیکن کسی بین الاقوامی سفری گائیڈ میں ابھی تک ان کا ذکر نہیں آتا۔ حالانکہ ہر سال دنیا کے ہر کونے سے لاکھوں مسلمان قافلہ در قافلہ اس ارض مقدس کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ پیدل، اونٹوں پر، موٹروں پر، ریلوں پر، کشتیوں میں، ہوائی جہازوں کے ذریعے سے..... روئے زمین پر اور کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں اتنی رنگتوں اور قومیتوں کے انسان بیک وقت اس کثیر تعداد میں جمع ہوتے ہوں۔

"مجھے اپنی لاعلمی پر ندامت ہے۔" امریکن ایکسپریس کے منیجر نے نقشوں کا سرسری جائزہ ختم کر کے کہا "لیکن اگر آپ مجھے دو روز کا وقت

دیں تو شاید میں آپ کو اس سفر کے متعلق کوئی مفید مشورہ دے سکوں"۔

دو روز کے بعد جب وہ دوبارہ امریکن ایکسپریس کے دفتر گیا تو منیجر کے سامنے بہت سے سفری گائیڈز کا انبار لگا ہوا تھا۔ ایک سفید کاغذ پر نیلی اور سرخ پنسل سے سعودی عرب اور اس کے اہم شہروں کا خاکہ بنا ہوا تھا۔ منیجر نے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام سے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے متعلق کچھ دلچسپ اقتباسات بھی نقل کر رکھے تھے۔ لیکن اس ساری کاوش کا عملی نتیجہ فقط اس قدر تھا کہ یورپ کا یہ وسیع اور ماہر سفری ادارہ مجھے یہ بتانے سے قاصر تھا کہ میں قاہرہ یا بیروت یا بغداد سے جدہ یا مکہ یا مدینہ کس طرح پہنچ سکتا ہوں۔

"اس سلسلے میں ہماری معلومات بہت ناقص ہیں"۔ منیجر نے معذرت کے انداز میں کہا"ہاں، حج کے زمانے میں کئی حکومتیں اپنے اپنے حاجیوں کے لئے ہوائی جہازوں، سمندری جہازوں اور خشکی کے قافلوں کا خاص انتظام کرتی ہیں۔ یہ انتظامات ہر جگہ سرکاری طور پر ہوتے ہیں، ہمیں ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی"۔

برسبیل تذکرہ منیجر صاحب نے مشفقانہ طور پر مجھے ایک اور مشورہ بھی دیا۔ انہوں نے اپنے بک شیلف سے ایک خستہ جلد والی کتاب نکال کر مجھے دکھائی۔ یہ ایک ڈچ پروفیسر کی کتاب "زیارت مکہ" تھی جو ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب عربی زبان کے بلند پایہ عالم تھے اور پندرہ برس تک لائیڈن یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کے صدر رہ چکے تھے۔ انہیں بے حد شوق تھا کہ وہ خود عربوں کے درمیان رہ کر عربی زبان سیکھیں۔ چنانچہ وہ جدہ میں ڈچ قونصل کے ہاں ملازم ہو گئے اور بھیس بدل کر چوری چھپے مکہ معظمہ میں داخل ہو گئے۔ یہاں پر کوئی ساڑھے پانچ ماہ وہ عبدالغفار کے فرضی نام سے رہے اور واپسی پر انہوں نے اپنی کتاب "زیارت مکہ" تصنیف کی۔

"میں پچھلے دو روز سے اس دلچسپ کتاب کا مطالعہ کر رہا ہوں"۔ منیجر نے کتاب کے بوسیدہ اوراق الٹ پلٹ کر کہا"میں سمجھتا ہوں کہ اس سفر میں ہر قدم پر آپ کی جان اور صحت کو سخت خطرات ہیں۔ اگر آپ میری مانیں تو سعودی عرب جانے کا ارادہ بدل ڈالیں۔ حسن اتفاق سے میرے پاس کیپری کی ایک بکنگ خالی ہے۔ کیپری سے تو آپ خوب واقف ہوں گے؟ نیلے نیلے بحیرۂ روم کے درمیان وہ خوشنما جزیرہ جہاں چمکیلی دھوپ ہے، خوبصورت سیر گاہیں ہیں، اطالیہ کے انگوروں کی بہترین شراب ہے، مصر کا سابق شاہ فاروق ہے۔ دراصل کیپری آج کل ساری دنیا کے سیاحوں کا مکہ ہے۔ اگر آپ زندگی کا لطف اٹھانا چاہتے ہیں تو میری رائے میں کیپری ضرور جائیے"۔

میں نے ہنس کر اسے یہ شعر سنایا:

اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی
میں موت ڈھونڈھتا ہوں زمین حجاز میں

"یہ آپ کی اپنی زبان ہے؟" منیجر نے پوچھا۔

میں نے اسے انگریزی میں اس شعر کا مفہوم سمجھایا۔

منیجر کسی قدر مایوسی سے سر ہلانے لگا"مشرق آخر مشرق ہے۔ ہم مغرب والے آپ کو کبھی نہیں سمجھ سکتے"۔

مجھے منیجر کی مایوسی پر کچھ کچھ افسوس ہونے لگا۔ اس غریب نے میرے لئے دو تین روز کافی محنت کی تھی۔ سعودی عرب کے متعلق اس کی معلومات میں قدرے خوشگوار اضافہ کرنے کی غرض سے میں نے اسے بتایا کہ جان اور مال اور صحت کے خطرات کے علاوہ اس ملک میں تیل کے چشمے بھی ہیں، اور آجکل ان چشموں کا ٹھیکہ ایک امریکن کمپنی کے پاس ہے۔

لیکن منیجر بدستور مایوسی سے اپنا سر ہلاتا رہا"مشرق میں جہاں کہیں تیل نکلتا ہے وہاں ایک نہ ایک روز کوئی مصدق بھی پیدا ہو کے رہتا ہے۔ ہم مغرب والوں کا زمانہ لد گیا۔ اب مشرق کی باری ہے۔ انڈونیشیا میں سوکارنو، عطا اور شہریار، ہندوستان میں گاندھی، پاکستان میں جناح، مصر میں نجیب اور ناصر"۔

اگر کوئی پڑھا لکھا ڈچ مشرق اور مغرب کی سیاست پر غور کرنے پر آئے تو وہ زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہو جاتا ہے۔ منیجر کے سارے آثار بتا رہے تھے کہ اب اسے بھی یہی دورہ پڑنے والا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ منیجر سارا دن مجھے اپنے پاس اسی کمرے میں بٹھائے رکھے گا، پنیر اور ڈبل روٹی کا لنچ کھلائے گا، ہر گھڑی دو گھڑی کے بعد کافی پلائے گا، شام کے پانچ بجے جب دفتر بند ہوگا تو مجھے اپنے ساتھ قریب کے کسی ریستوران میں لے جائے گا پھر نہ معلوم رات کے کس وقت تک گفت گو کا یہ لامتناہی سلسلہ جاری رہے۔ [illegible]

معرب ہو تو کسی ڈچ نے لیے اس کا مطلب محض انڈونیشیا اور ہالینڈ ہوتا ہے! ہالینڈ نے انڈونیشیا میں کیا کیا خوبیاں اور کیا کیا خرابیاں پیدا کیں، ہالینڈ اور انڈونیشیا کے تعلقات کب بگڑے، کیوں بگڑے، کس نے بگاڑے.....

لیکن خوش قسمتی سے یہ آئی ہوئی بلا انکوائری گرل کی برکت سے ٹل گئی۔ اُس نے اندر آکر درجن ڈیڑھ درجن لوگوں کی فہرست مینجر کے سامنے رکھ دی جو کسی نہ کسی سلسلے میں آج ہی اُس سے ملاقات کرنے والے تھے۔ موقع غنیمت جان کر میں مینجر اور انکوائری گرل دونوں کا شکریہ ادا کرتا ہوا وہاں سے نکل بھاگا۔

جس مشکل کو لے کر میں امریکن ایکسپریس کے دفتر میں داخل ہوا تھا وہ مشکل بدستور ایک سوالیہ نشان کی طرح میرے سامنے موجود تھی۔ ساری دنیا کے ہوائی اور سمندری اور خشکی کے راستوں پر ایک بھی ایسا ذریعہ نظر نہ آتا تھا جو مجھے حجاز پہنچا سکتا۔ اپنی اس مجبوری کے سامنے مجھے رہ رہ کے مراکش کا وہ بلند ہمت نوجوان یاد آتا تھا جو شادی کے فوراً بعد اپنی دلہن کو لے کر حج پر روانہ ہو گیا تھا۔ منزل بہ منزل، پا پیادہ چلتے چلتے جب یہ میاں بیوی مدینہ منورہ پہنچے تو ان کی گود میں تین بچے تھے!

اس سفر کے متعلق بیروت، دمشق اور بغداد سے بھی سفری ایجنسیوں اور سفارت خانوں کی وساطت سے جو خبریں موصول ہوئیں وہ بے حد مایوس کن تھیں۔ ہاں قاہرہ سے اُمید کی ایک مدھم سی کرن ضرور جھلملائی۔ مصر کی انقلابی حکومت نے یہ انتظام کیا تھا کہ حج سے پہلے تین چار ہفتوں میں ہر دوسرے روز بحری اور ہوائی جہاز مصر سے حجاز جایا کریں گے۔ یہ جہاز مصری حاجیوں کے لیے مخصوص تھے۔ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ ان جہازوں میں کسی پاکستانی مسافر کے لیے بھی جگہ نکل سکے گی یا نہیں۔ بہرحال یہ خبر اس لحاظ سے اطمینان بخش تھی کہ آخر ایک راہ تو ایسی نظر آئی جس کے لیے انسان کچھ دوڑ دھوپ کر سکتا ہے۔ باقی سب راہیں یا تو مسدود تھیں یا اُن پر خاموشی اور لاعلمی کے گہرے کہرا بے چھائے ہوئے تھے۔

جب میں نے مصر والی خبر اپنے ایک لبنانی دوست مصطفیٰ الغزی کو سنائی تو اُس نے مایوسی سے سر ہلایا "تم جا کر کوشش کر دیکھو۔ مجھے تو ہرگز اُمید نہیں کہ تمہیں کامیابی ہو۔"

پھر امریکن ایکسپریس کے مینجر کی طرح مصطفیٰ الغزی نے بھی مجھے ایک مفید مشورہ دیا "اگر قاہرہ پہنچ کر بھی تم ناکام رہو تو سیدھے بیروت چلے آنا۔ وہاں میرے بہت سے دوست احباب ہیں۔ وہ تمہیں خوب سیر کرائیں گے۔ بیروت مشرق وسطیٰ کا پیرس ہے۔ وہاں کی نائٹ کلب یورپ کی نشاط گاہوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آجکل سمیعہ جمال بھی وہاں آئی ہوئی ہے۔ وہ مصر کے سابق شاہ فاروق کی محبوب رقاصہ تھی!"

مصر کے سابق شاہ فاروق کے ساتھ اب مجھے ایک قسم کی ذاتی رنجش پیدا ہونے لگی تھی۔ حجاز کے لیے میں جو راستہ بھی نکالتا تھا، اُس پر وہ الف لیلیٰ کے جادوگر بادشاہوں کی طرح کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہو کے رہتا تھا۔ کیپری میں وہ خود بہ نفس نفیس موجود تھا۔ بیروت میں اُس کی محبوب رقاصہ تھی۔

پیرس پہنچ کر خیال آیا، چلو پاکستان اور سعودی عرب کے سفارت خانوں سے سفر حج کے متعلق کوئی ہدایات یا اطلاعات ہی حاصل کرتا چلوں۔ لیکن پیرس کی زندگی جن ٹیڑھے ترچھے خطوط پر چلتی ہے اُس نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا۔ فرانسیسی باشندوں کی بات تو دوسری ہے، لیکن پیرس میں رہنے والے باہر کے لوگ عموماً گیارہ بجے کے قریب سو کر اُٹھتے ہیں۔ بارہ بجے تک ناشتے سے فارغ ہو کر دفتر جاتے ہیں۔ ڈیڑھ بجے سے لنچ کا وقفہ شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد قیلولہ حفظان صحت کے عین مطابق ہے۔ تین ساڑھے تین بجے دفتر پھر کھلتے ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ باقی رہے سہے اوقات لازماً عصر کی نماز کے ساتھ ٹکراتے ہوں گے۔ چنانچہ مجھے کسی اسلامی مملکت کے سفارتخانہ تک جانے کی ہمت نہ ہو سکی۔

لیکن یہ کمی نیپلز پہنچ کر پوری ہو گئی۔ نیپلز میں مجھے حج اور اسلام کے متعلق کچھ ایسے راز معلوم ہوئے جو ارباب بصیرت کے لیے بے حد سبق آموز ہیں۔

نیپلز کے ہوٹل 'ڈومینس' کے ڈائننگ روم میں ایک مشکل یہ پیش آئی کہ جو ملازمہ میری میز پر مامور تھی وہ انگریزی زبان سے قطعی ناآشنا تھی۔ کھانے کا مینو اطالوی زبان میں چھپا ہوا تھا اور میری سمجھ سے بالکل بالا تھا۔ میں نے ہزار کوشش کی کہ کھانے کے انتخاب کے متعلق

کسی طرح ملازمہ پر اپنا مفہوم واضح کر سکوں لیکن وہ ہر بار اپنی گردن مٹکا کر اور شانے سکیڑ کر مسکرا دیتی تھی۔ میری کس مپرسی بھانپ کر قریب والی میز سے ایک نوجوان اُٹھ کر آیا اور نہایت شستہ انگریزی میں بولا "کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

"شکریہ!" میں نے کہا "میں ملازمہ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ وہ میرے لیے گوشت یا شراب نہ لائے۔ اگر مچھلی یا انڈے موجود ہوں تو وہ لے آئے لیکن وہ سؤر کی چربی میں تلے ہوئے نہ ہوں۔"

ملازمہ آرڈر لے کر چلی گئی تو نوجوان نے مجھ سے پوچھا "کیا آپ ہندوستان کے رہنے والے ہیں؟"

"جی نہیں، میں پاکستانی ہوں۔"

"الحمد للہ!" نوجوان نے گرم جوشی سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "میں شام کا رہنے والا ہوں۔ آئیے آپ ہماری میز پر آ جائیے۔ میں آپ کو اپنی منگیتر سے ملاؤں گا۔ ہم دونوں کو پاکستان سے بڑی دلچسپی ہے۔"

اپنی میز پر پہنچ کر وہ شامی نوجوان خالص مغربی انداز سے تعارف کی رسوم ادا کرنے میں مشغول ہو گیا "میرا نام رشید مومن ہے۔ یہ میری منگیتر نزہیہ ہے۔ ہم دونوں دمشق کے رہنے والے ہیں۔ روم میں فنون لطیفہ کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ آجکل نیپلز آئے ہوئے ہیں تاکہ پومپیائی کے کھنڈروں کا مطالعہ کر سکیں۔"

پھر اُس نے نزہیہ سے میرا تعارف کرایا "آپ پاکستانی ہیں۔ الحمد للہ ہمیں پاکستان سے بڑی محبت ہے۔ ہے نا نزہیہ؟ آپ گوشت نہیں کھاتے۔ شراب نہیں پیتے۔ انڈوں اور مچھلی سے بھی بھاگتے ہیں، اگر وہ چربی میں تلے ہوئے ہوں تو۔ غالباً سگرٹوں سے بھی پرہیز ہوگا۔ معلوم نہیں نزہیہ ایسے لوگ یورپ آ کر کیا کرتے ہیں؟" رشید مومن نے ہنس کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ میں کوئی کمزوری نہیں ہے؟" نزہیہ نے اخلاقاً کہا۔

"جی ہاں،" میں نے مذاقاً جواب دیا "چھوٹی موٹی کمزوری تو کوئی نہیں!"

رشید مومن نے زور کا قہقہہ لگایا۔ نزہیہ کچھ جھینپ سی گئی۔

"واللہ نزہیہ، جب تم شرماتی ہو تو تمہارے گال اس شراب کی طرح عنابی ہو جاتے ہیں۔" رشید مومن نے ریڈ وائن کا گلاس اٹھا کر کہا۔ پھر انہوں نے اپنے اپنے جام بلند کیے اور بڑی گرم جوشی کے ساتھ پاکستان کا جام صحت پیا۔

جواباً میں نے پانی کا گلاس اُٹھایا اور کہا "آپ دونوں کی محبت کا جام صحت! میری دعا ہے کہ آپ کی محبت اس پانی کی طرح پاکیزہ اور اس شراب کی طرح تند رہے!"

کچھ دیر اسی قسم کی پُر لطف باتیں ہوتی رہیں۔ رشید مومن کی باتوں میں نہایت سلجھا ہوا مزاح تھا۔ نزہیہ کا معصوم خلوص بڑا دلآویز تھا۔ رفتہ رفتہ گفتگو کا رُخ میرے سفرِ حجاز کی طرف پھر گیا۔ اگرچہ اس وقت تک رشید مومن اور نزہیہ سرخ اطالوی شراب کی تین بوتلیں ختم کر چکے تھے اور اُن کی آنکھوں میں سرور کی لطیف سی غنودگی بھی اُتر آئی تھی لیکن حجاز کا ذکر سن کر وہ دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔

"آپ حجاز جا رہے ہیں؟ آپ بڑے خوش نصیب ہیں۔ واللہ آپ بہت ہی خوش نصیب ہیں۔" نزہیہ نے نہایت جوش سے کہا۔ اب اُس کی آنکھوں میں عقیدت کی ایسی چمک۔ ایسا کیف چھلک آیا تھا جو سرخ اطالوی شراب کے نشے سے کہیں زیادہ گہرا اور خوشنما تھا۔

"آپ نزہیہ کی باتوں میں نہ آئیں۔" رشید مومن نے کسی قدر درشتی سے کہا "سب جوان لڑکیاں وہمی اور زود اعتقاد ہوتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ حجاز پہنچ کر آپ بہت پشیمان ہوں گے۔"

"خدا کے لیے رشید ایسی باتیں نہ کرو۔" نزہیہ نے احتجاج کیا۔ اُس کے لہجے میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی "اگر تم ایسی باتیں کرو گے تو میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی۔ واللہ کبھی معاف نہ کروں گی۔"

"میرا تجربہ ہے کہ نزہیہ کا غصہ ہمیشہ عارضی ہوتا ہے!" رشید مومن نے بے پروائی سے کہا "میرا انسانی فرض ہے کہ میں اس کی وقتی خفگی گوارا کروں، لیکن حجاز کے متعلق آپ کو کسی قسم کی گمراہی میں مبتلا نہ رہنے دوں۔"

اپنے اس فرض منصبی کی ادائی میں رشید مومن نے حجاز اور حج پر ایک فصیح و بلیغ تقریر کا آغاز کیا۔ حجاز رہزنوں، بھکاریوں، مچھروں اور غلاظت کی سرزمین ہے۔ حج ایک بین الاقوامی بلیک مارکیٹ ہے جس میں سونا اور کھجوریں اور مذہبی عقائد برسر عام نیلام ہوتے ہیں۔ توہم پرستی کے زہریلے جراثیم اس فضا میں پرورش پاتے ہیں۔ وہاں کے باشندے درندگی اور سخت گیری کا مجسمہ ہیں۔ حاجیوں کے ساتھ وہ کتوں سے بھی برا برتاؤ کرتے ہیں۔ صفائی کا کہیں بھی کوئی انتظام نہیں۔ سڑکوں پر، گلی کوچوں میں،

مکانوں اور دکانوں کے سامنے، مسجدوں کے وضو خانوں میں دن رات پیشاب اور پاخانہ ہوتا ہے۔ عورتیں اور مرد بے حیائی سے برسرِ عام حوائج ضروری سے فارغ ہوتے ہیں۔ نہانا تو برطرف، ہاتھ منہ تک دھونے کے لیے پانی نہیں ملتا۔ ہر سال لاکھوں انسانوں کی غلاظت رس رس کر آس پاس کے کنوؤں میں جمع ہوتی رہتی ہے، اور یہ غلیظ پانی مسلمان بڑے شوق سے پیتے ہیں، اپنے چہروں پر ملتے ہیں، اور بوتلوں اور کپیوں میں بھر کے تبرکاً اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ جب آپ احرام باندھ لیں گے تو آپ پر یہ فرض عائد ہو جائے گا کہ اپنے بدن کی ساری گندگی کو بڑھ چڑھ کے نمایاں کریں۔ بال کاٹنا، شیو کرنا، ناخن تراشنا گناہ ہے۔ دانتوں پر برش کرنے کی ممانعت ہے۔ میل کچیل دور کرنے کی نیت سے نہانا بھی خلاف شرع ہے۔ پھر اس کثیف اور غلیظ ہیئت کذائی میں یکایک مجبور کیا جائے گا کہ آپ سر کے بال منڈا ڈالیں۔ اس عمل کے بعد جو مضحکہ خیز صورتیں برآمد ہوتی ہیں، انہیں اچھا مسلمان تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے اجسام پسینے اور میل کی بدبو سے متعفن ہوتے ہیں، لیکن ان کی روحیں پاک ہو جاتی ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔ اگر یہ اسلام ہے، تو......

رشید مومن بڑے جوش و خروش سے اسلام پر تبصرہ کرتا رہا اور زہرہ اس کے سامنے ایک زخم خوردہ ناگن کی طرح بیٹھی بل کھاتی رہی۔ وہ بار بار اپنے گلاس کو غصے سے چھلکاتی تھی۔ کبھی بوتلیں اٹھا اٹھا کر زور سے میز پر مارتی تھی۔ کبھی نیپکن کو اپنی کلائی کے گرد یوں بھینچ بھینچ کر لپیٹتی تھی کہ اس کی مرمریں باہوں میں خون کی رگیں ابھر ابھر کر بڑی حدت کے ساتھ کپکپانے لگتی تھیں۔ زہرہ کی آنکھوں سے ڈر لگتا تھا کہ شاید ابھی ان سے آگ کے شعلے لپک پڑیں گے۔ اس کے چہرے کے آثار بتا رہے تھے کہ اگر اس نے زبان کھولی تو اس کے دہن سے زہر کے فوارے پھوٹ بہیں گے۔ ہماری میز پر ایک تلخ سا سناٹا چھا رہا تھا۔ گفتگو کا رخ بدلنے کے لیے میں نے آرکسٹرا کی تعریف شروع کر دی جو رمبا ڈانس کی سریلی دھنیں بجا رہا تھا۔

"بے شک آرکسٹرا بڑی حسین موسیقی بجا رہا ہے۔" رشید مومن نے گویا چونک کر کہا "تم دونوں یہاں بیٹھ کر خدا اور رسول کی باتیں کرو۔ میں اس اطالوی لڑکی کے ساتھ ناچنا چاہتا ہوں جو بیچاری بہت دیر سے تنہا بیٹھی ہے۔"

رشید مومن نہایت بھدے پن سے اٹھا، اور لڑکھڑاتا ہوا ایک دوسری میز پر چلا گیا جہاں ایک خوبصورت اور آراستہ لڑکی لائم جوس سے جی بہلا رہی تھی۔ اس نے رشید مومن کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور کچھ دیر بعد لائم جوس چھوڑ کر وہ شمپین پینے میں مشغول ہو گئے۔

رشید مومن بڑے انہماک سے اس لڑکی کے ساتھ ڈانس کرتا رہا، اور زہرہ اپنی کرسی پر بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب حسرت، ایک عمیق غصہ، ایک شدید انتقام جھلک رہا تھا۔ وہ بار بار کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے ہونٹ کپکپا کر، کچکچا کر رہ جاتے تھے۔

رمبا۔ والز۔ کوک سٹیپ۔ سامبا...... ایک کے بعد دوسرا ڈانس ہوتا رہا۔ اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے زہرہ کے پاؤں شراب، موسیقی اور نغمے کی ترنگ میں بڑی المناکی سے لڑکھڑاتے رہے۔ آدھی رات گئے جب ہوٹل ہڈمینس کا بال روم بند ہونے لگا تو رشید مومن اطالوی لڑکی کے بازو میں بازو ڈالے ہمارے پاس آیا۔ وہ دونوں نشے میں چور تھے۔

"یہ کیا واہیاتی ہے۔" رشید ناراض ہونے لگا "ابھی رات شروع بھی نہیں ہوئی اور یہ کم بخت ہوٹل والے ڈانس بند کر رہے ہیں۔ چلو ہم سب کاسینو چلیں۔ وہ صبح تک کھلا رہتا ہے۔"

"میں بہت تھک گئی ہوں۔" زہرہ نے بیزاری سے کہا "تم خوشی سے جاؤ۔"

"بہت اچھا۔ شب بخیر۔ مجھے امید ہے کہ ہمارا پاکستانی بھائی بدستور تمہارا دل بہلاتا رہے گا۔ خدا کی قسم پاکستانی بڑے اچھے لوگ ہیں۔ شراب نہیں پیتے۔ سؤر نہیں کھاتے۔ گرمیوں میں حج پر جاتے ہیں، اور زہرہ جیسی خوبصورت لڑکیوں کا جی بہلاتے ہیں... ہا ہا ہا... ہا ہا ہا...." رشید مومن پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتا، جھومتا، لڑکھڑاتا ہوا اطالوی لڑکی کے ساتھ باہر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد زہرہ میز پر کہنیاں ٹیکے دم بخود بیٹھی رہی۔ اس کا سر اس کی ہتھیلیوں پر ٹکا تھا۔ مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ اگر اب اس نے رونا شروع کر دیا تو میں کیا کروں گا؟ ہر لمحہ مجھے ڈر تھا کہ میز پر پڑے ہوئے نیپکن پر اچانک ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگیں گے۔ میں دل ہی دل میں وہ الفاظ اور فقرے تلاش کر رہا تھا جو ایسے نازک موقعوں پر لڑکیوں کی دل جوئی کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ زہرہ نے مجھے اس آزمائش سے بال بال بچا لیا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی ہتھیلیوں سے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں بے حد خشک تھیں۔ سوکھی ہوئی ٹکڑیوں کی طرح جو

چنگاری دیکھتے ہی بے اختیار شعلے اُگلنے لگتی ہیں۔ اُس کا چہرہ تھکن آلود تھا۔ اُس نے نیم غنودگی کے عالم میں کہا "آئیں ہم بھی کسی دوسرے نائٹ کلب میں چل کے بیٹھیں۔ یہاں مجھے سخت وحشت ہو رہی ہے۔"

"آپ بہت تھک گئی ہیں" میں نے کہا "آپ اپنے کمرے میں جاکر آرام کریں تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"نہیں۔ میں اپنے کمرے میں ہرگز نہ جاؤں گی۔ اگر اس وقت میں اکیلی رہ گئی تو رو رو کر میرا برا حال ہو جائے گا۔"

"آپ اکیلی نہ ہوں گی۔ میں نے کہا "جب تک آپ کو نیند نہ آجائے میں آپ کے پاس بیٹھوں گا۔"

زہیہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی "ہمارے ملک میں ایک کہاوت ہے کہ اگر مرد اور عورت کسی جگہ اکیلے رہ جائیں، تو ان کے ساتھ تیسرا ساتھی شیطان شامل ہو جاتا ہے۔"

"شیطان کے ساتھ میرے بھی دیرینہ مراسم ہیں" میں نے مذاق کیا "لیکن اب ہم دونوں نے ایک دوسرے سے باعزت سمجھوتہ کر لیا ہے۔"

زہیہ ہنسنے لگی۔

اُوپر جانے کے لیے جب ہم لفٹ میں سوار ہوئے تو زہیہ کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر لفٹ بوائے عجیب انداز سے مسکرایا۔

"آپ کی شب خوش خوش بسر ہو" لفٹ بوائے نے جھیں آثار کر دعا دی۔

"شکریہ" میں نے اُسے ایک سویرا کا ٹپ دیا۔

"اب اگر میں ساری عمر ایک فرشتہ بن کے رہوں" زہیہ اپنے کمرے میں پہنچکر کہنے لگی "پھر بھی لفٹ بوائے کی نظر میں وہی رہوں گی جو اُس نے مجھے اس وقت سمجھا ہے۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا "انسان غلط فہمیوں کا پتلا ہی تو ہے۔"

"ہمارے ملک میں اسے گناہ بے لذت کہتے ہیں" زہیہ کہنے لگی "گناہ کا شبہ گناہ سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ بری بات ہو جائے تو وہ ماضی کا ایک واقعہ بن جاتا ہے۔ مستقبل کو اس واقعے سے بچانا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ لیکن بری بات کا شبہ خون میں ملے ہوئے زہر کی طرح ہمیشہ جاری رہتا ہے۔"

زہیہ نے بستر سے کمبل اُٹھا کر اپنے جسم پر لپیٹ لیا اور صوفے کی بڑی کرسی پر تکیہ لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ "یہ کچھ عجیب بات ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی فریب سے آلودہ ہوتا ہے۔ کبھی ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں کبھی دوسرے ہمارے متعلق دھوکا کھانے لگتے ہیں۔"

زہیہ اب اچھے موڈ میں تھی۔ اُس نے سگرٹ سلگا کر اپنا سگرٹ لائٹر مجھے دیا جس پر نہایت خوبصورتی سے لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ نقش کیا ہوا تھا۔

"امریکن کمپنیاں یہ لائٹر خاص طور پر اسلامی ممالک کے لیے بنا کر بھیجتی ہیں" زہیہ ہنسنے لگی "پہلے کلمہ طیبہ سے ایمان کی شمع روشن ہوتی تھی اب اس کی مدد سے سگرٹ سلگائے جاتے ہیں۔"

"وہ لفٹ بوائے مجھے جوجی چاہے سمجھے" زہیہ پھر سنجیدہ ہو گئی "لیکن دمشق میں میری بزرگ ماں کسی اور ہی خیال میں سرگرداں ہو گی۔ شاید اس وقت وہ میرے لیے دعا مانگ رہی ہو۔ شاید وہ سوچ رہی ہو کہ میں اب بھی اُسی پابندی سے نماز اور قرآن پڑھتی ہوں جس طرح اپنے گھر میں پڑھا کرتی تھی۔"

زہیہ نے کروٹ لے کر اپنا اٹیچی کیس کھولا جو صوفے کے قریب ایک تپائی پر پڑا تھا اور اُس میں سے ریشمی غلاف میں لپٹا ہوا چھوٹی تقطیع کا قرآن مجید نکالا۔

"جب میں یورپ آرہی تھی تو میری ماں نے مجھے یہ تحفہ دیا تھا۔ سال بھر سے میں نے اسے ایک بار بھی کھول کر نہیں دیکھا۔ لیکن میں جہاں کہیں جاتی ہوں اسے اپنے ساتھ ضرور رکھتی ہوں۔"

"یہ بھی آپ کی عین سعادت مندی ہے" میں نے کہا۔

"مجھے کچھ وہم سا ہو گیا ہے کہ اگر قرآن شریف کی یہ جلد مجھ سے جدا ہو گئی تو شاید میری پیاری ماں کو کچھ ہو جائے گا۔"

"ساری دنیا کی الہامی کتابوں میں قرآن مجید بڑا مظلوم صحیفہ ہے" میں نے طنزاً کہا "کچھ لوگ اسے تعویذ بنا کر گلے میں یا بازوؤں پر باندھتے ہیں۔ بعض لوگ پاکٹ سائز کے قرآن جیبوں میں رکھتے ہیں۔ یوں بھی ہر اسلامی گھرانے میں ایک دو قرآن خوبصورت غلافوں میں ضرور رکھتے ہیں۔ خواہ وہ طاق نسیاں کی زینت ہی کیوں نہ ہوں۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جس گھر میں یہ کتاب نہ ہو، وہاں اللہ کی برکت نازل نہیں ہوتی۔"

اب زہیہ کا موڈ بالکل ٹھیک ہو گیا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور مجھے

تسبیحوں کے قصے سنانے لگی کہ کس طرح مصر اور شام کے لوگ فیشن کے طور پر اپنے ہاتھ میں تسبیح رکھتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں دنیا، دوسرے میں دین.....

کچھ دیر کے بعد جب میں رخصت ہونے لگا تو نزہیہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ پھر اُس نے ہچکچاتے ہچکچاتے کہا آپ میرے لیے ایک تکلیف گوارا فرمائیں گے؟

"بسروچشم۔" میں نے کہا۔

نزہیہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر بولی "جب آپ خانۂ کعبہ کا طواف کریں تو وہاں فقط ایک بار میرا نام لے دیں۔"

"یہ تو بہت معمولی فرمائش ہے۔" میں نے کہا "وہاں پر میں آپ کے لیے دعا بھی ضرور مانگوں گا۔"

"آپ ایک بار بس میرا نام ہی لے دیں۔ اس سے زیادہ مجھے کوئی اور حق بھی تو نہیں۔" نزہیہ نے اُس نمی کو چھپانے کی ناکام سی کوشش کی جو معاً اُس کی خوبصورت آنکھوں میں اُتر آئی تھی۔

"میں ضرور آپ کا نام لوں گا۔ ایک بار نہیں کئی بار۔ اور جب روضۂ اقدس پر حاضر ہوں گا تو آپ کا سلام بھی ضرور عرض کروں گا۔"

روضۂ اقدس کے نام پر نزہیہ نے جلدی سے اپنے گلے کا ریشمی اسکارف اُتار کر اُس سے سر ڈھانپ لیا۔ وہ کچھ دیر خاموش کھڑی رہی۔ کچھ کہنا چاہا لیکن ہچکچا کر خاموش ہو گئی۔

لفٹ بوائے لفٹ سے ٹیک لگائے اونگھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے اپنی ٹوپی درست کی اور کن انکھیوں سے گھور کر مسکرایا۔ میں نے پھر اُسے ایک سولیرا کا نوٹ دیا۔

کچھ دیر بعد جب رشید مومن واپس آئے گا تو شاید اس لفٹ بوائے کو ایک بار پھر کن انکھیوں سے گھور کر مسکرانے کی حاجت پیش آئے گی!

اور میں آج تک یہی سوچتا ہوں کہ اگر میں ساری عمر بھی خانۂ کعبہ کا طواف کرتا رہوں تو شاید مجھے احساس کی وہ معراج نصیب نہ ہو گی جو نزہیہ کے مقدر میں لکھی ہوئی ہے۔ نزہیہ جو ریڈ وائن پی کر بھی رشید مومن سے روٹھ جاتی ہے کیونکہ وہ حج کے متعلق بے سروپا باتیں کرتا ہے۔ نزہیہ جو اب قرآن نہیں پڑھتی لیکن اپنی ماں کا تحفہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ نزہیہ جس کے نزدیک خدا کے گھر پر اُس کا صرف اتنا حق ہے کہ ایک اجنبی فقط ایک بار اُس کا نام وہاں لے دے۔ نزہیہ جو روضۂ اقدس کے ذکر پر اپنے اسکارف سے اپنا سر ڈھانپ لیتی ہے۔ نزہیہ جو اپنا سلام وہاں پیش کرنے سے بُری طرح ہچکچاتی ہے.....

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر   روزِ محشر عذرہائے من پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر   از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر

ابن انشا

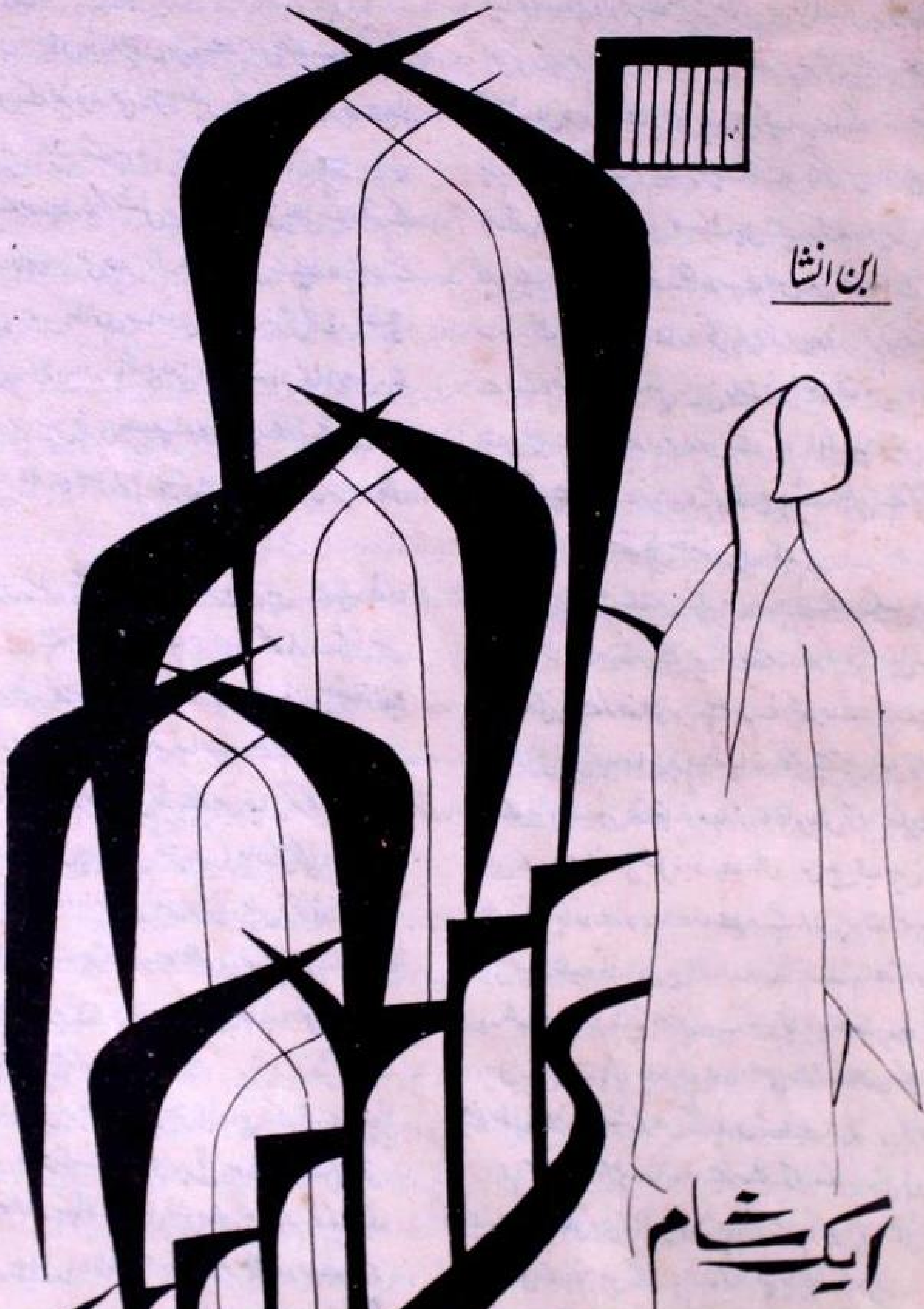

ایک شام ماضی کی محرابوں میں

بیروت کی باتیں

سادھوؤں، سنتوں اور ولیوں وغیرہ سے ہمیں عقیدت تو ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ ان کے بغیر نواہ بھی نہ توڑ سکیں۔ لیکن یاروں کو تجھ سے حاتی کیا خوش گمانیاں ہیں۔ جنیوا کے ہوٹل ST. CERVAIS یعنی سان پروسے کے بعد ہماری کوشش یہ رہی کہ لادینی یعنی سیکولر قسم کے ہوٹلوں میں رہیں۔ قاہرہ میں بھی جہاں لوگ اسلامیات کی سند لینے اور کباب تکے کھانے جاتے ہیں، ہمیں اطالوی عیسائیوں کے ایک ہوٹل گارڈن سٹی دجاردن ستی) میں رہنا پڑا۔ اور سپاگیٹی یعنی اطالوی سویاں کھانا پڑیں۔ بلکہ نہ کھانی پڑیں کیونکہ ہم انہیں چھری سے اپنے کانٹے پر رکھتے تو تھے لیکن وہ منہ تک کا نٹا آنے سے پہلے ہی پھسل کر پھر پلیٹ میں جا رہی تھیں۔ اب یہاں بیروت میں....

ہوا یہ کہ ہمیں یہاں پہنچتے ہی ہمارے میزبانوں میں سے ایک نے کہا کہ سان بیل ہوٹل میں چلے جاؤ۔ ہم نے کہا ہم آ بیل مجھے مار کے قائل نہیں۔ ہمیں تو قاہرہ میں پروفیسر محمد حسن الاعظمی نے مشورہ دیا تھا کہ فندق ستعنقورالجدید میں جانا۔ گھر کا سا آرام ملے گا۔ ہم نے پروفیسر صاحب سے کہا کہ اس نکتے پر زور نہ دیجیے۔ ہم ایسے بے شمار ہوٹلوں میں ٹھہر چکے ہیں جہاں گھر کا سا آرام ملتا رہا ہے۔ یعنی دروازے میں چابی نہیں لگتی۔ بستر کی چادر کئی کئی دن نہیں بدلی جاتی۔ کوئی بیرا ہماری آواز پر کان نہیں دھرتا۔ ہمیں تو کوئی اچھا ہوٹل چاہیئے۔ گھر کا سا آرام مطلوب ہوتا تو گھر سے نکلتے ہی کیوں، یورپ کیوں آتے۔ لیکن پروفیسر صاحب کی تاکید یہی تھی کہ اسی ہوٹل میں جانا۔ واقعی آرام دہ ہے۔ سب سے بڑا آرام تو یہی ہے کہ سستا ہے۔

پس ہوٹل سان بیل پر ہم نے اعتراض کیا کہ اس کے نام سے چڑیل کی بو آتی ہے۔ ہمیں یہ نکتہ بتانے میں خاصی دیر لگی۔ اور خاصی لغت چھاننی پڑی۔ لیکن پھر کسی نے لکھ کر بتایا کہ سان بیل نہیں سان بعل۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے۔ کسی لفظ میں ح یا ق یا ط یا ظ وغیرہ آ جائے تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ عربی اور اسلامی چیز ہے۔ اسی لیے پورس کے مقابلے میں ہمارا رجحان سکندر اعظم کی طرف زیادہ رہا۔ سکندر اعظم ہی نہیں، ارسطو، افلاطون، بقراط، بطلیموس فیثا غورث وغیرہ کو ہم نے ہمیشہ مسلمان ہی جانا۔ سان پر تو ہم نے غور نہیں کیا۔ بعل کی ع پر ہم چپ ہو گئے۔ لیکن جب ہم ہوٹل پہنچے تو معلوم ہوا یہ تو سینٹ پال کا ہوٹل ہے۔ یعنی یہاں بھی کلیسا مرے آ گئے۔ اب بیٹھو اور انجیل کا جاپ کرو۔ ممکن ہے ہم سینے پر صلیب کا نشان بنا کر اس وقت بھی رخصت ہو جائیں۔ ہم ایسے گنہگاروں کا سینٹ پال جیسے برگزیدہ ولیوں سے کیا کام لیکن ایک تو ہم تھکے ہوئے تھے دوسرے عین اس کے احاطے کی دیوار کے ساتھ لائٹ ہاؤس یعنی المنارہ نظر آیا۔ چونکہ ان دنوں ہم تقاضائے بشریت سے بہت کام لے رہے ہیں۔ یعنی راستہ فوراً بھول جاتے ہیں۔ اس لیے یہ نشان غنیمت معلوم ہوا۔ جہازوں کے لیے بنایا گیا ہے لیکن ہمارے بھی کام آ سکتا ہے۔ ہمارے نسیان کا حکمی علاج بے شک نہیں ہے کیونکہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں۔ تاہم خیر....

دم تحریر رات کے دس بجے ہیں اور ہم اپنے سوٹ کیس میں اپنی فرنچ زبان کی ڈکشنری ڈھونڈ رہے ہیں تاکہ ہاتھ منہ دھو سکیں۔ تفصیل گس کے باغ میں جانے کی یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے ہم نے دیکھا ہمارے کمرے میں تولیہ کوئی رکھا ہی نہیں گیا۔ صابن ہم اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں لیکن تولیہ تو مسز البرز کے ہوٹل تک میں ملتا تھا۔ خواہ چارگرہ کا تھا۔ یہاں تو ہم نے کرہ بھی ایسا لیا تھا جس کے ساتھ اپنا ذاتی غسل خانہ ہے۔ اگرچہ اس میں ٹب نہیں ہے اور شیشہ اتنا اونچا لگا ہے کہ ہم جیسے خاصے اونچے آدمی کی صرف آنکھیں اس میں نظر آتی ہیں۔ شاید صرف بالوں میں کنگھا کرنے کے لیے لگایا ہے تاکہ لوگ بے جا طور پر بار سنگھار میں وقت ضائع نہ کریں۔ ایک خطرہ ہمارا یہ ہے کہ یہ کمرہ داڑھی والے پادریوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ ہم ایسے داڑھی مونڈنے والوں کے لیے نہیں۔ خیر صبح سٹول پر کھڑے ہو کر شیو کریں گے یا دل کے آئینے میں خود کو دیکھیں گے۔

ہم اطمینان سے کپڑے اتارے بیٹھے تھے۔ تولیہ کے لیے ٹیلی فون اٹھایا تو نیچے سے عربی سنائی دی۔ آخر پتلون پہنی، کوٹ پہنا، جوتا پہنا، ٹائی لگائی اور نیچے ہوٹل کے دفتر میں گئے۔ ہم نے کہا تولیہ چاہیئے۔ ٹاول۔

وہاں جو لڑکا تھا۔ بس بیٹھا رہا۔ بولا تو عربی بولا۔

بیروت میں عربی چلتی ہے اور فرنچ۔ عربی ہماری مذہبی زبان ہے

سے ہم دنیاوی کاموں میں لانا پسند نہیں کرتے اور فرنچ بے شک ہم بہت سی جانتے ہیں لیکن جس طرح اپنے کاغذات کو اپنے تھیلے میں اور کپڑوں کو سوٹ کیس میں رکھتے ہیں۔ اس طرح اپنی فرنچ کی لیاقت کو بھی ہم نے اپنی ڈکشنری اور فرنچ بول چال کی کتاب میں رکھ چھوڑا ہے۔ تاکہ ذہن میں مختلف زبانوں کا ہجوم نہ ہو جائے اور مزید علم کے لیے اس میں گنجائش رہے۔ ہم نے لڑکے کو اشارے سے ہاتھ دھو کر دکھائے۔ اس پر وہ صابن کی ایک ٹکیہ نکال لایا۔ ہم نے کہا یہ نہیں۔ اور خیالی تولیے سے اپنا جسم رگڑ کر دکھایا۔ شاید وہ ہمیں ورزش کا شوقین سمجھا۔ کیونکہ الماری کھول کر ڈمبلوں کی ایک جوڑی نکال کر رکھ دی۔ مایوس ہو کر ہم اوپر اپنے کمرے میں آ گئے۔ تھوڑی تلاش سے جرمن ڈکشنری مل گئی اور اس میں تولیے کے لیے HANDTUCH کا لفظ بھی نوٹ کر کے لے گئے کہ جرمنی آخر فرانس کا ہمسایہ ہے۔ لیکن بے کار۔ اگر فرنچ ڈکشنری نہ ملی۔ شاید کہیں پولینڈ یا مصر میں ہم بھول آئے ہوں تو ہمارا احوال قرون وسطیٰ کے پادریوں اور عیسائیوں کا سا ہوگا کہ نہانے دھونے کو مسلمانوں کی بدعت جانتے تھے جسم سے پسینے کی بو آتی تھی تو بس پوڈر چھڑک لیتے تھے۔ کل بازار جائیں گے تو یا تو تولیہ خرید لائیں گے یا پوڈر کا ڈبہ۔ ان میں سے جو بھی چیز سستی ملی۔

کل رات اوپر کی سطریں لکھنے کے بعد ہم نیچے گئے تو آخر دفتر میں مونچھوں والے ایک پہلوان مل گئے جو شاید ہوٹل کے منیجر ہیں۔ تولیے کے ذکر پر لڑکے سے بولے:۔

"ابے جا، لا کے تولیہ دے صاحب کو۔"

وہ سکڑتا ہوا گیا اور کسی تھیلے میں سے ایک رومال سا نکال لایا۔ ہم نے کہا اس سے تو ہم ایک طرف پونچھیں گے دوسرے کا کیا کریں گے۔ اس پر ایک اور رومال عنایت ہوا۔ ہم نے شکریہ ادا کر کے۔۔ پاؤں پھیلائے اور کہا ہمیں گرم پانی بھی چاہیے شیو کرنے کو اور بندہ بشر ہے کبھی نہانے کو بھی جی چاہتا ہے۔ خصوصاً جبکہ غسل خانہ کمرے کے ساتھ لگا ہو۔ اس نے کہا اس قسم کی ہمہ وقت گرم پانی ملنے کی عیاشی تو ہلٹن وغیرہ میں ہوتی ہے۔ ہم تو صبح ساڑھے سات بجے کے بعد گرم پانی نل میں چھوڑتے ہیں۔ ہم نے کہا، "اچھا آپ کی بڑی مہربانی۔ لیکن دیکھیے چھوڑیے گا ضرور۔"

صبح آنکھ تو ہماری جلد کھل گئی لیکن لیٹے ساڑھے سات بجنے کا انتظار کرتے رہے۔ لبنان میں اب گرمی نہیں ہے۔ ہم اپنا موٹا سوٹ نہ پہنیں تو سردی لگتی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے یہ لوگ ابھی تک ہمارے کمرے کے نلوں کی ٹنکی میں برف کی سل ڈالتے ہیں۔ ہم نے ساڑھے سات بجے نل کھولا اور کھولے رکھا۔ کچھ فرق نہ پایا۔ آٹھ بجے کے قریب معلوم ہوتا ہے ان لوگوں نے برف نکالی اور اب خالی ٹھنڈا پانی رہ گیا۔ لیکن ہم نہانے پر تلے ہوئے تھے نہا کے رہے۔

اور یہ بھی ہم عرض کر دیں کہ شمع توحید کے پروانے ہونے کے باوجود یہ باقیماندہ دن غالباً ہم ہوٹل سینٹ پال میں گزاریں گے کیونکہ آج دوپہر مسلمانوں کے ہوٹل فندق سقفور الحدید ہو آئے ہیں۔ یہ یہاں کے ڈاؤن ٹاؤن ساحۃ الشہداء میں واقع ہے۔ ڈھونڈنے میں خاصی دیر لگی کیونکہ ہر مکان کی ہر منزل پر ایک نئے ہوٹل کا بورڈ ہے۔ وہاں کی مارکیٹ کے نواح کا نقشہ نظر آیا۔ اتنی گندگی تو ہم برداشت کر لیتے ہیں جتنی پاکستان میں ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ کی عادت نہیں۔ غسل خانے کے کمرے کے ساتھ ہونے کی بات تو دور رہی۔ وہ تو دو مسافروں کو ایک کمرے میں رکھتے ہیں تاکہ باہم محبت بڑھے۔ قدرِ عافیت معلوم کر کے ان کا کارڈ لے کر ہم آ گئے۔ لکھا ہے ——

یتوفر فیہ للمسافر کل اسباب الراحۃ نظافۃ خارقۃ معاملت جیدۃ۔ حمامات ضمن الغرف باسعار لا تزاحم۔ ہماری سمجھ میں اس میں سے فقط اسباب، راحت اور حمام وغیرہ کے لفظ آئے یعنی وہ چیزیں جو ہم نے وہاں نہ پائیں۔

یہاں شرق وسطیٰ میں ایک چیز البتہ ہم نے ایسی پائی کہ ہمارا وطن واپس جانے کا اشتیاق کمزور پڑ گیا ہے۔ قاہرہ اور بیروت کے لوگ جوہر شناس ہیں۔ ہر جگہ ہمارا تعارف السید ابن انشا کے نام سے ہوا۔ ہمارے ملک میں ذات پات کو لوگوں نے موروثی جاگیر بنا رکھا ہے اگر آپ سید پیدا ہوئے ہیں تو آپ کو سید مانیں گے ورنہ نہیں۔ اچھے بھلے لوگ عمر بھر موچی کے موچی رہتے ہیں۔ ہم عالم عرب سے اپنے سید ہونے کی بہت سی سندات اپنے ساتھ لائے ہیں۔ کیونکہ منطقی کی جائے تو زیادہ مستند ان لوگوں کا فرمایا ہوا ہے۔ سادات کا آغاز ادھر کہیں عرب ہی میں ہوا تھا۔ ہندوستان پاکستان کے لوگوں کو اس قسم کا حکم لگانے کا کوئی حق نہیں۔ انجمن سادات امروہہ اور وظیفۃ المومنین وغیرہ کو چاہیے کہ ہمارے نام کی ممبری کی پرچی کاٹ رکھیں ورنہ ہم آ کر فساد مچائیں گے۔ استغاثہ کریں گے اپنے ایسے تمام سیدوں کو اپنے ساتھ ملا لیں گے۔ پاکستان میں ان کی تعداد موروثی سیدوں سے کم نہیں ہے۔

دمشق میں عشق

پہلی رمضان کی افطار ہمیں طرابلس الشام میں صلیبیوں کے قلعے اور مسجد خالد بن ولید کے آس پاس ہوئی اور دوسری رمضان کے چاند نے ہمیں دمشق کی تنگ و تاریک محرابی چھتوں والی گلیوں میں گھومتے پایا۔

یہ دن اتوار کا تھا اور بیروت میں بارش ہو رہی تھی۔ اپنی طرف سے تو ہم نے بہت جلدی کی لیکن ساحۃ البرج کے ٹیکسی والے کے لیے پہلی سواری ہم تھے اور باقی چار کی تلاش میں وہ ہمیں غچہ دے رہا تھا کہ بس پانچ منٹ میں چلتے ہیں۔ اس تاخیر پر ہم نے جو غصہ اتارا وہ انگریزی میں تھا۔ ہمارے جی کا غبار کچھ دُھلا اور ٹیکسی والا بے مزہ بھی نہ ہوا کیونکہ وہ یہ زبان نہ جانتا تھا۔ ہم نے کئی بار ٹکٹ واپس کرنے کی کوشش کی کہ کسی دوسری ٹیکسی میں چلے جائیں لیکن یہی زبان کی دقت حائل رہی۔ ناچار ٹیکسی والے کے ساتھ ہم نے بھی مسافر ڈھونڈنے شروع کر دیے۔ کسی شخص کو آتا دیکھتے تو آواز لگاتے "دمشق، دمشق، دمشق، اے بھائی دمشق، اے میاں دمشق چلو گے؟ ایک سواری دمشق کی"۔ وہ سر ہلا کر آگے بڑھ جاتا۔ ہمیں سخت جھنجھلاہٹ ہو رہی تھی کہ دمشق اتنی اچھی جگہ ہے۔ یہ لوگ جاتے کیوں نہیں۔ یہاں کیوں گھوم رہے ہیں۔ ہم دوبارہ اپنی انگریزی کی دھار تیز کر رہے تھے کہ تین عورتیں بظاہر بارش سے بچنے کے لیے سائبان کے نیچے آ کھڑی ہوئیں ایک موٹی اور خاصی عمر کی۔ دوسری جوان، گود میں بچہ اور تیسری ایک لڑکی، جسے دیکھتے ہی ہم نے فوراً حضرت شیخ سعدی سے کہ ہمارے غائبانہ پیر رہی ہیں، فرمائش کی کہ یہ ہماری ہم سفر ہو اور لالچ بھی دیا کہ آپ کے نام کی پانچ پیسے کی ریوڑیاں بانٹیں گے۔ ہم ایسے مستجاب الدعوات کبھی بھی نہ تھے۔ بلکہ ہمارے معاملے میں دعا کو اثر کے ساتھ اکثر دشمنی رہی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے اس وقت باب رحمت غلطی سے کھلا رہ گیا تھا۔ یا حضرت سعدی ریوڑیوں کے پھیر میں آ گئے۔ اس لڑکی نے کہا: "تین ٹکٹ دمشق کے"۔

یا تو ہمیں ایک لفظ عربی کا نہ آتا تھا یا پھر زبان ایسی رواں ہوئی کہ ہم راستے بھر یعنی دمشق تک مس فریال المدنی سے عربی میں باتیں کرتے گئے۔ اس کو انگریزی کے صرف دو لفظ آتے تھے۔ "ویری نائس" (بہت عمدہ)، چنانچہ ہماری عربی پر بھی انہوں نے یہی برتے۔ بھلا ہو مولوی محمد حسن کا۔ اگر زندہ ہیں تو اللہ ان کو نوح کی عمر عطا کرے۔ ورنہ کم از کم اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ عربی پڑھاتے ہوئے ہمیں چودہ کے چودہ صیغے ایک سانس میں دہرانے پر مجبور کرتے تھے۔ آج وہ کام آگئے اور چند الفاظ عربی کے۔ لا۔ نعم۔ اجل۔ جاء۔ فی۔ عن۔ شکراً طیب وغیرہ نے بھی بڑی مدد دی۔ یہ شامی لڑکی تھی۔ یہ بادام سی آنکھیں اور سیب کے سے گلابی گال۔ نقش موٹے موٹے تھے لیکن دلآویز اور صحت مند اور سکارلٹ اور شیریں آواز تو ان نقوش میں عجیب رنگ بھر دیتی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ بچے والی میری اخت ہے یعنی بہن۔ ہم نے کہا اور یہ بڑھیا تمہاری ماں ہو گی۔ بولیں، نہیں یہ میری خالہ ہیں۔ آگے چل کر ٹیکسی کو ایک گلی میں ٹھہرایا تو ایک شخص جس کے چہرے پر خشونت اور مونچھوں کی فراوانی تھی، سوار ہوا۔ یہ مس فریال کا بہنوئی تھا۔ اس کو دیکھ کر ہماری رطب اللسانی میں تھوڑا سا فرق ضرور پڑا۔ لیکن ہم نے ہتھیار نہ ڈالے۔ مس فریال دمشق میں طالبِ علمی کرتی تھیں۔ ہم نے کہا۔ ہم بھی طالب علمی کرتے ہیں اور کاتب ہیں۔ کاتب حضرات بُرا نہ مانیں کہ ہم خوشنویسی اور غلط نویسی سیکھے بغیر ان کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ عربی میں کاتب ادیب کو کہتے ہیں۔ خواہ وہ ہم ایسا بدخط اور شکستہ خط ہی کیوں نہ ہو۔ عربی بولتا پا کر ان کی خالہ بھی عربی کے ٹانکے لگانے لگیں۔ لیکن ہم نے ان پر کچھ اعتنا نہ کی۔ زبانِ حال سے کہا تو یہی کہا کہ چپ رہو بڑی بی۔ ہمیں اتنی عربی نہیں آتی اور جو آتی ہے وہ فریال بانو کے لیے ہے۔ ہم فقط ماہ رخوں کے لیے مصوری سیکھنے والے لوگ ہیں۔

بیروت سے نکلنے کے گھنٹہ بھر بعد جبل لبنان کی چڑھائی شروع ہو گئی اور پھر تو ہم اُوپر تھے اور بادل نیچے وادی میں۔ سردی بھی شروع ہو گئی تھی۔ شطورہ نامی قصبے میں ٹیکسی رکی اور یہ لوگ کہ روزہ رکھے ہوئے تھے کھانے پینے کی چیزیں پھل پھلاری وغیرہ خریدنے کے لیے رُکے۔ فریال نے ہم سے کہا۔ آپ کچھ نہ کھائیں گے۔ ہم نے کہا نہیں۔ بولیں روزہ ہے؟ ہم نے کہا، ہم سفر میں ہیں روزہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں ہم بھی نکل کر دکان پر چلے گئے اور اپنے لئے کچھ سیب پسند کئے اور پیسے دینے کو جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس بانو نے روک دیا کہ پیسے ہم دیں گے۔ ہم نے کہا اے جانِ قیس! تو چاہے تو ہمیں بے دام خرید سکتی ہے۔ پیسوں کا تکلف نہ کر۔ لیکن نہیں۔ ہمیں یہ سیب قبول کرنے پڑے۔

فریال کی نشست ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ ہم تو پیچھے لڑکی کے ساتھ بیٹھے تھے ان کی بڑھیا خالہ کے سایہ عاطفت میں۔ فریال آگے کی سیٹ پر ہمارے بالمقابل اس کے ساتھ اس کا قصاب نما بہنوئی اور پھر ڈرائیور۔ لیکن وہ

لڑکی ایسی تھی کہ سارا وقت پیچھے کو منہ کئے بیٹھی رہی۔ بات بے بات اس ملائمت اور اپنائیت سے دیکھ لیتی تھی کہ بس ــــ

بولیں: کے روز رہو گے دمشق میں؟

ہم نے کہا: اے دخترِ شام، ہم مسافر ہیں۔ آج رات چلے جائیں گے واپس۔ یا زیادہ سے زیادہ کل۔ کیونکہ اب ہماری واپسی کا دن قریب آ رہا ہے۔ ہمارا دامنِ خیال مت پکڑ۔ اس قسم کی دلبری کا کچھ فائدہ نہیں۔ لیکن وہ اس پر مُصر رہی کہ دمشق سے آج مت جانا۔ کم از کم دو دن رہنا۔

ہم نے کہا۔ اچھا جو حکم۔ اس کے پاس اس کی تصویریں تھیں۔ ہم نے ایک مانگی تو اس نے اپنے بہنوئی کی طرف آنکھ کا اشارہ کیا کہ اس سے خبردار۔

اور پھر دمشق آ گیا۔ جہاں یاروں نے عشق فراموش کر دیا تھا محض اس لئے کہ ذرا قحط سالی ہو گئی تھی۔

ہم دمشق کے چوک میں ٹیکسی سے اترے ہی تھے کہ ایک شخص بھاگا بھاگا آیا۔ بغداد، بغداد، بغداد؟

ہم نے کہا: "میاں ہم تو ابھی دمشق آئے ہیں تو ہمیں بغداد کیوں دھکیل رہا ہے۔ وہاں دھرا کیا ہے۔ بجز اکبر کے اور امرود کے؟"

بولا: "زیارت؟"

ہم نے کہا: "لا"۔ یعنی اگر زیارت کرنی بھی ہے تو تیری ضرورت نہیں۔ ہاں ہمیں فندق عدن کا پتہ بتا دے۔

فندق عدن کا نام ہمیں پروفیسر حسن الاعظمی صاحب نے قاہرہ میں دیا تھا اور اس کے مالک ایک سیالکوٹی ہیں۔ مدت سے یہاں مقیم ہیں۔ لہٰذا عبداللہ ہندی کہلاتے ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ رات رہنی پڑی تو ان کے فندق میں رہیں گے۔ ورنہ دعا سلام تو کریں گے ہی۔ ان سے زیارت گاہوں کا پتہ مقام وغیرہ پوچھیں گے۔

اس شخص نے کہ نام تو اس کا سلیمان تھا لیکن شکل اس کی ہُدہُد کی تھی۔ ہم سے کہا فندق عدن؟ اچھا میں بتاتا ہوں۔"

ہمارا خیال تھا وہ انگلی سے اشارہ کر کے بتا دے گا یا چند قدم چل کر ہماری رہنمائی کر دے گا۔ اور ہم شکریہ کہہ کر آگے چل دیں گے۔ لیکن اس نے ہمیں آگے چلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ہم کافی تیز چلنے بلکہ بھاگنے والے آدمی ہیں لیکن وہ تو ہُدہُد کی طرح پھدکتا ہوا چلتا تھا۔ چوک پار کر کے ایک گلی ایک سے دوسری حتیٰ کہ کوئی ڈیڑھ فرلانگ دور ہمیں لے گیا اور بولا:

"یہ رہا فندق عدن۔" باہر لکھا تھا۔ فندقِ قصرِ عدن۔

ہم نے اندر جا کر پوچھا۔ عبداللہ ہندی صاحب ہیں؟

وہاں ایک صاحب بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور شاید شعر کہہ رہے تھے۔ بولے "وہ تو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ آجائیں گے۔ آپ کو کمرہ چاہیئے؟ کمرہ لے لیجئے۔"

ہمارے پاس سامان تو کچھ تھا ہی نہیں۔ ہم نے کہا۔ اچھا ہم پھر آئیں گے۔

اب میاں ہُدہُد پھر سڑک پر پھدکنے لگے۔ وہ آگے آگے ہم پیچھے پیچھے ہم نے کہا۔ ملے جنت کدھر؟ بولا۔

"جامع اموی۔ سُوق حمیدیہ۔"

ہمیں ان جگہوں پر جانا تو تھا ہی۔ سو چا ٹھیک ہے کچھ دے دیں گے اسے۔ وقت بچے گا۔ ورنہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ سُوق حمیدیہ یعنی دمشق کا قدیم بازار یہ سامنے ہے اور جامع اموی اس کے عین پیچھے۔ میاں ہُدہُد ہمیں بازار میں لے جانے کا زیادہ اشتیاق رکھتے تھے۔ کبھی شیشے والی گلی میں۔ کبھی زیورات والے بازار میں۔ کبھی سوینرز کی دکانوں پر۔ ہم نے کہا۔ یا شیخ ہمیں کچھ نہیں خریدنا۔ جامع اموی چل اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے مقبرے چل اور حضرت بلال حبشی کی قبر پہ لے چل اور مدرسہ عادلیہ اور امام غزالی۔۔۔۔

یہ شخص بھیڑ میں ایسا طرارے بھرتا ہوا چلتا تھا کہ تعجب ہوتا تھا یا پھر ایں طرارے بھرتے ہم نے ایک پیر مرد ہفتاد سالہ کو قاہرہ میں دیکھا تھا جو اپنے لانبے کُرتے اور سفید داڑھی اور عمامے میں سچ مچ کا نہیں بلکہ ہالی ووڈ کی کسی الف لیلیٰ قسم کی فلم کا کردار لگتا تھا۔ ایک زقند میں بیس سیڑھیاں اُتر گیا تھا۔ ہم میاں ہُدہُد کو بار بار بریک لگاتے تھے۔ "رفیق لاتسرع لاتسرع"۔ یعنی میاں باندھ کے چل۔ لاتسرع (جلدی مت کر) کا لفظ ہم نے آج ہی سیکھا تھا۔ دمشق کے راستے میں ایک ٹرک ہمارے آگے آگے تھا۔ اس کی پشت پر لکھا تھا جیسے ہمارے ہاں لکھا رہتا ہے "ہارن دے کر پاس کریں" یا "سامان سو برس کے ہیں کل کی خبر نہیں" وغیرہ۔ مطلب ہم نے "لاتسرع" کا اس لئے نکال لیا کہ اس وقت ہمیں عربی آ رہی تھی۔ ہم مس فزیال سے گفت گو جو کر رہے تھے۔ اب رہی سہی میاں ہُدہُد پر صرف ہو رہی تھی۔

اور آخر پہلے شکستہ محرابی دروازے نظر آئے۔ دیواریں بلا چھت

کے۔ جانے یہ پرانے سُوقِ حمیدیہ کی باقیات تھیں یا مسجد کا باب اوّل۔ اس کے بعد مسجد کا دروازہ۔ نعلین کو در بغلین کیا۔ ایک شخص دوڑا دوڑا آیا۔ مسلمان؟ پاکستان؟ ہم نے جی میں تو کہا کہ میرے دین و مذہب کو تم پوچھتے کیا ہو اس نے تو!

لیکن بظاہر یوں گویا ہوئے کہ دریں چہ شک۔ الحمدللہ۔ کیا ہم صورت سے مسلمان نہیں لگتے؟

ایک شام ماضی کی محرابوں میں

"معتکف بودم بر مزارِ حضرت یحییٰ علیہ السلام در جامع دمشق۔"

یہ شیخ سعدی کی آواز تھی جو بچپن سے ہمارے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ان الفاظ سے گلستان کی ایک حکایت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ مزار صحنِ مسجد میں نہیں بلکہ عین مسجد کے اندر چھت کے نیچے ہے اور سنگِ مرمر کی جالی سے گھرا ہوا ہے اور اس پر ایک سبز گنبد ہے اور ہر چہار طرف ہمہ وقت کچھ نہ کچھ لوگ یہاں معتکف رہتے ہیں۔ ہم نے بھی یہاں چندے اعتکاف کیا۔ شیخ سعدی کے وسیلے سے شرحِ صدر کی دعا مانگی۔ میاں ہدہد بھی ہمارے ساتھ دوزانو ہو گئے۔ خدا جانے انہوں نے کیا دعا مانگی ہو گی۔ ممکن ہے یونہی ہاتھ اٹھائے ہوں۔ کیونکہ انہیں ہر سیاح کے ساتھ اٹھانے پڑتے ہوں گے یا پھر یہ کہا ہو گا کہ یا مولا اس اجنبی کے دل میں آج شام سخاوت ڈال۔ اس کے ہاتھوں اور بٹوے میں برکت دے۔ اس کی دعا تو اگر اس نے یہی مانگی تھی ایک واجبی حد تک منظور ہوئی۔ ہماری دعا کا نتیجہ ابھی نکلنا باقی ہے۔

مسجد کے اندر دو تین جگہ وعظ بھی ہو رہا تھا۔ مسند پر آلتی پالتی مارے ایک بزرگ اسلام کی عظمتِ ماضی کا قصہ کہہ رہے تھے۔ لوگ کھڑے کچھ بیٹھے سُن رہے تھے۔ بعضے اُٹھ کر دوسرے واعظ کے مؤکلین میں جا شامل ہوتے تھے۔ جو شمالی جانب کے دروازے کے قریب بیٹھا رمضان کے فضائل بیان کر رہا تھا۔ چھت اُونچی اور شاندار ہے۔ لیکن زیادہ پرانی نہیں ہے کیونکہ اس مسجد کو ان صدیوں میں بارہا شکست و ریخت اور طوفانِ غارت و آتش میں سے گزرنا پڑا ہے۔ اب ہم جنوبی جانب کے وسیع برآمدے میں نکل آئے اور جوتا پہن صحنِ مسجد میں سے گزر مشرقی دروازے کی طرف آئے۔ گویا یہاں صحنِ مسجد میں جوتا پہنا جا سکتا ہے۔ مسجد کے مغربی دروازے کے ساتھ امام غزالی کا مکتب تھا۔ ہم نے اپنے خضرِ راہ سے اس کا نشان پوچھا لیکن وہ کوئی تاریخ تھوڑی پڑھا تھا۔ اس کا کام تو اڈے سے مسافروں کو گھیر گھار کر ہوٹلوں میں پہنچانا تھا۔ صحن میں پانی ٹپک رہی تھی۔ مرمت ہو رہی تھی۔ اور بارش کی پھسلن تھی اور ہمارے جوتے چکنے فرش پر رپٹے جا رہے تھے لیکن میاں ہُدہُد ہمارے لاتسرع۔ لاتسرع پر کان دھرے بنا برابر لپکے جا رہے تھے۔ مشرقی دروازے سے نکلیں تو باہر بھر اونچی شکستہ محرابیں دکھائی دیتی ہیں۔ انہوں نے ہلاکو کی یورش بھی دیکھی ہو گی۔ تیمور کی بھی۔ یہیں وہ مشرقی منارہ ہے جس پر ایک روایت کے بموجب قیامت کے روز حضرت عیسٰی علیہ السلام اُتریں گے۔ بائیں ہاتھ کو مڑئیے تو سلطان صلاح الدین غازی کی تربت کا قبہ سامنے تھا۔ ایک چھوٹے دروازے سے اندر داخل ہو گئے۔ وہاں ایک بزرگ بیٹھے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ ایک نوجوان نے اُٹھ کر دوسرا دروازہ کھولا اور سامنے اس فاتح کی آرام گاہ تھی۔ جس کے پرچم کے آگے مشرق اور مغرب سرنگوں تھے۔ جس نے یورپ کے متحدہ لشکروں کا سامنا کیا اور اپنی فتوحات اور حسنِ اخلاق کی داستانیں چھوڑ گیا۔ آج جبکہ سرزمین شام کے ایک کونے اور بیت المقدس کو غاصبوں نے دبا رکھا تھا اور فلسطین کے مہاجر صحراؤں میں دربدر پھر رہے تھے۔ یہ فاتح لمبی تانے سو رہا تھا ہم نے کہا اے غازی! اُٹھ کہ تو اب نہیں اُٹھے گا تو کب اُٹھے گا۔ کیا خوب قیامت کا بھی ہو گا کوئی دن اور؟

فاتحہ سے فارغ ہو کر ہم پھر نکلے۔ گھوم کر مغربی دروازے سے دوبارہ مسجد میں داخل ہوئے۔ اب گائیڈ صاحب باہر کھڑے رہے۔ ہم نے پھر ایک بار ننگا ہوں کو اس رواقِ کہنہ کے نظارے سے سیراب کیا۔ ایک بار پھر مزار حضرت یحییٰؑ پر بیٹھے اور تصور کیا کہ ہمارے شیخ حضرت سعدی علیہ الرحمۃ بھی یہیں کہیں معتکف ہوئے ہوں گے اور اس سامنے کے دروازے سے وہ لولا لنگڑا آدمی داخل ہوا ہو گا جسے دیکھ کر شیخ اپنے پاؤں میں جوتا نہ ہونے کا غم بھول کر رب کا شکر ادا کرنے لگے کہ جوتا نہ سہی میرے پاؤں تو ہیں۔ ورنہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے پاؤں نہیں۔ ہم نے بھی شکر ادا کیا کہ ہوس کی تو انتہا نہیں۔ قسامِ ازل نے ہمیں پہلے ہی ہمارے حصے سے زیادہ دے رکھا ہے۔

باہر میاں ہدہد اپنی لمبی چونچ نکالے ہمارے منتظر تھے۔ ہم ایک بار پھر سوقِ حمیدیہ کی طرف چلے اور اس کے دروازے پر پہنچ کر ہم نے اسے

کچھ دے دلا کر رخصت کیا کیونکہ ہم تو اس شہر کے در و دیوار سے باتیں کرنے آئے تھے۔ یہاں سیاحت کے تحفے لینے نہیں آئے تھے۔ ہمیں حریر اور زری کے سامان نہ خریدنے تھے۔

بڑے بازار کی چھت تو قدیم نہیں ہے اب تو اُسے ٹین کی چادروں سے پاٹا گیا ہے لیکن ایک بغلی گلی میں، ہمیں محرابوں کا ایک سلسلہ نظر آیا اور ہم نے اس میں غوطہ مارا۔ اس وقت شام اُتر رہی تھی۔ روزہ دار اپنی دکانوں کو سمیٹنے لگے تھے اندھیری گلیوں کو زیرو نمبر کے نیلے بلب ایک آسیبی سا اجالا بخش رہے تھے۔ داہنی طرف کو ایک بڑا دروازہ نظر آیا۔ یہ مدرسۂ ناصریہ تھا جس کی بنا سلطان صلاح الدین ایوبی کے بھائی سلطان ناصر الدین ایوبی نے رکھی تھی۔ آگے گلی اور تنگ ہو کر داہنی طرف کو مُڑ گئی تھی دونوں طرف کی بالکنیوں کے جھروکے ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ یہ پرانے جھروکے اڑواڑوں پر قائم تھے لیکن نیچے کی ڈیوڑھیاں اور محرابیں اور طاقچے سب قدیم تھے۔ چوبی دروازے بھی عہد پاستاں کی کہانیاں کہتے تھے۔ یہ تھا امویوں کا دمشق۔

دمشق اس وقت بھی آباد تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دین حق کی منادی کی۔ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں بھی یہ رونق پر تھا۔ آشوریوں اور ایرانیوں کے رایت بھی اس کی فصیلوں پر لہرائے اور سکندر اعظم کے بعد اہل مقدونیہ بھی یہاں اپنا سکہ چلا گئے۔ چودھویں سنہ ہجری میں خالد بن ولید کے ہمراہ عبیدہ بن جراح اور یزید بن ابی سفیان کے ہاتھوں یہ فتح ہوا۔ خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے عہد میں اس کی حکومت امیر معاویہ کے ہاتھ میں تھی اور ۴۱ھ سے یہ امویوں کا پایۂ تخت اور تمام دولِ اسلامیہ کا مرکز بن گیا لیکن یہ طرۂ امتیاز اس کی دستار میں فقط صدی بھر کو رہا۔ مصر میں خلافت عباسیہ منتقل ہونے کے بعد کبھی یہ مصر کے تابع رہا، کبھی بغداد کے سلجوقیوں کی بعض شاخیں بھی اس پر کچھ دن حکومت کر گئیں اور پھر ہلال و صلیب کے معرکے برپا ہونے شروع ہوئے۔ یہ مدرسہ ظاہریہ ہے جس کے اندر ملک الظاہر کا مقبرہ ہے۔ یہ مدرسہ عادلیہ ہے۔ جہاں ابن خلکان درس دیتے تھے۔ یہ مدرسہ اتابکیہ ہے۔ یہ مدرسہ، ڈیوڑھیاں اور محرابیں۔ محرابیں اور طاق جن میں کوڑا کرکٹ کے ڈھیر ہیں اور ڈیوڑھیاں جن میں سے اندھی اندھی گلیاں جانے کدھر نکل گئی ہیں۔ بظاہر گلی بند معلوم ہوگی۔ سامنے ایک مکان نظر آئے گا لیکن بس وہیں سے خم کھا کر کسی طرف کو نکل جائے گی اور پھر محرابوں کی بھول بھلیاں میں گم ہو جائے گی۔ کہیں چند سیڑھیاں اور پھر ڈھلوان گلی اُوپر ہی اوپر۔ اور پھر یک لخت نیچے اُتر جائیے۔ اس جھٹ پٹے میں ساری گلی میں بس ایک بچہ کھڑا تھا۔ بولا مرحبا۔ ہم نے کہا: جیتے رہو نونہال۔ ان محرابوں کے بیچوں بیچ کوٹھریاں ہیں جن میں کہیں کوئی ٹین گر ہے کہیں لوہے کا کباڑی ہے۔ کہیں کوئی درزی کپڑے سی رہا ہے کہیں آگ پر سماوار چڑھا ہے اور سامنے کلچے پھیلے ہیں۔ ایک جگہ بغیر چراغ جلائے اندھیرے ہی میں ایک بڈھا موچی اپنے یا کسی اور کے جوتے میں کیلیں ٹھونک رہا تھا۔ اب روزہ کھل گیا تھا۔ دکانیں بند ہو گئی تھیں اور شیشے کے کواڑوں کے پیچھے لوگ میز کے گرد بیٹھے افطار کر رہے تھے۔ حمص یعنی کابلی چنے کی کھٹائی دار دال میں چمچہ چل رہا تھا۔ یہ دمشق تھا بکتبوں کا دمشق۔ پرانی داستانوں کا دمشق۔ الف لیلوی دمشق۔ ایک گلی میں ہم نکلے تو بس ایک دکان ایک بزاز کی کھلی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں بیٹھا حساب لکھ رہا تھا۔ سامنے گلی کے اس طرف ایک آدھی ڈھئی ہوئی گنبد دار عمارت کھڑی تھی۔ ہم نے پوچھا، کیوں میاں جی یہ مسجد ہے؟ بولے ہاں۔ ہم نے کہا نام اس کا کیا ہے۔ معلوم ہوا یہ سلطان صلاح الدین کے آقا سلطان نورالدین شہید کی مسجد ہے اور اسی کے اندر اس کی تربت ہے۔ ڈیوڑھی بے چراغ تھی۔ ہم دبے پاؤں اندر گئے تو صحن میں بھی کوئی نہ تھا ہاں صحن سے پرے ایک دروازہ تھا اس کے پیچھے شاید کوئی ہوگا۔ ہم نے وہیں سے فاتحہ پڑھی اور اُلٹے پاؤں لوٹ آئے۔ رات اتر آئی تھی۔ چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس۔ لیکن ہمیں تو کوئی جلدی نہ تھی۔ ہم تو ان گلیوں میں گم ہو جانا چاہتے تھے جذب ہونا چاہتے تھے۔ یہاں کسی گائیڈ کی حاجت نہ تھی۔ گائیڈ تو رستہ ڈھونڈنے اور پتہ رکھنے کے لیے ہوتا ہے۔ گم ہونے اور بھولنے اور اپنے آپ کو کھونے کے لیے گائیڈ کی کیا حاجت۔ اور پھر ہم ان تاریک کیچڑ بھری گلیوں میں گم ہو گئے۔ کچھ یاد نہ رہا کہ کدھر کو جانا ہے۔ یہی گندی کیچڑ بھری گلیاں ہی تو ہمارے ماضی سے ہمارا رشتہ تھیں۔ ایک جگہ پھر کسی مدرسے کی اونچی ڈیوڑھی نظر آئی۔ ہم نے نام پڑھنے کے لیے ماچس جلائی لیکن کچھ نہ پڑھ سکے۔ گلی دور دور تک سنسان تھی۔ ایک جگہ چراغ جل رہا تھا۔ وہاں سے ایک آدمی ایک پیالہ لئے ہوئے نکلا اور پیشتر اس کے کہ ہم اس سے پوچھتے یار رفیق! یہ کونسا مکتب ہے۔ دوسری گلی میں غائب ہو گیا۔ اور پھر اندھیرے سے مسجد اموی کے مینار پیدا ہوئے اور ہم نے

حساب لگایا کہ ہم اس کے جنوبی دروازے پر نکل آئے تھے۔ یہاں ایک چبوترہ تھا۔ چبوترہ تو نہیں ایک نیچی دیوار تھی۔ پرانے وقتوں کے کسی پشتے کا حصہ۔ ہم ٹیک لینے کو رک گئے بیٹھ گئے۔

اور پھر اس پشتے کے نیچے سے کوئی بولا: یہاں ایک مندر تھا میں اس مندر کی آخری اینٹ ہوں۔ اس کے اوپر کا ردا بولا۔ میں اس کلیسا کی دیوار ہوں جو رومن قیصر آرکاڈیس نے اس مندر کی جگہ پانچویں صدی عیسوی میں بنایا اور پھر اس کے اوپر کے پتھر بولے۔ ہم اس خانۂ خدا کے قدیم پتھر ہیں اور ہمیں پہلی صدی ہجری میں ولید بن عبدالملک بن مروان نے یہاں جمایا تھا۔ بارہ ہزار کاریگر اور معمار اور سنگ تراش بلادِ روم سے آئے تھے اور شب و روز کام کرتے تھے۔ ایک کے بعد ایک سلطان خلیفہ، پاشا، صوفی درویش، متکلم یہاں آکر سجدہ ریز ہوئے۔ ناگہاں شور سا اٹھا۔ فصیلوں پر چلو، فصیلوں پر چلو۔ یورپ کے قہرمان صلیبی پرچم لیے منزلیں مارتے یہاں آ پہنچے تھے۔ یہ فرانس کے لوئی ہفتم کا لشکر جرار ہے وہ جرمن کے قیصر کونارڈ سوم کے زرہ پوش نائٹ گھوڑے بڑھاتے آ رہے ہیں۔ فصیلوں پر چلو۔ فصیلوں پر چلو۔ محاصرہ۔ محاصرہ۔ تیغوں کا رن پڑتا ہے۔ منجنیقیں چلتی ہیں۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ اور پھر یہ بادل چھٹ جاتا ہے۔ اب ایوبیوں کا دور دورہ ہے۔ سلطان صلاح الدین اپنے سمند پر سوار تشریف لاتے ہیں۔ گلیوں میں ٹھٹ لگے ہیں۔ نقارہ بجتا ہے۔ ایوبی پرچم کھلتا ہے اور کھلتا چلا جاتا ہے اور بیت المقدس کو اپنے سائے میں لے لیتا ہے۔

اور پھر یہ نقارہ کسی اور قسم کے شور میں دب جاتا ہے۔ یہ کیا ہوا۔ یہ کیسے ہجوم ہیں۔ یہ سلطان غازی کی میت لحد میں اتاری جا رہی ہے۔ کل من علیہا فان۔ کل من علیہا فان۔ لیکن دیکھو یہ پھر گھوڑوں کی ٹاپوں کا شور گونجا۔ فصیلوں پر چلو۔ فصیلوں پر چلو۔ یہ ہلاکو خاں کی فوج بے اماں ہے۔ گلیوں، محرابوں، ڈیوڑھیوں کے دروازے بند ہو گئے۔ اور پھر ہلاکو خاں فصیلیں چیر کر چڑھ آیا اس مسجد کو جلا دو۔ ڈھیر کر دو۔ یہاں ہماری مسند بچھا دو اور پھر مسجد کی چھت جلنے لگی۔ ڈھیر ہو گئی۔ دمشق کے آسمان پر دھواں ہی دھواں پھیل گیا اور جب مطلع صاف ہوا تو ہلاکو بے نشان ہو چکا تھا۔ ایمان والوں نے مسجد پھر کھڑی کر دی تھی۔ ایک بار پھر مشرقی منارے سے پچاس موذنوں نے مل کر اذان دی۔ پھر مدرسے کھلے لیکن یہ دمشق تھا۔ ابھی اسے اور سہنا جانا تھا۔ اب تیمور لنگ کی باری تھی۔ پھر فصیل شق ہوئی۔ طبل بجا رایت کھلا اور دمشق غارت ہوا اور پھر مسجد سے شعلے بلند ہوئے اور اس کی ٹنڈ منڈ محرابیں اور دیواریں باقی رہ گئیں۔ یہ لشکر لوٹا تو دمشق کے بیشمار قالین بافوں کو بھی ہانکتا ہوا ساتھ لے گیا۔ ان کو ماوراءالنہر میں آباد کرو۔ دمشق کو اجاڑ دو۔ لیکن مسجد پھر کھڑی ہوئی دمشق پھر آباد ہوا حتیٰ کہ سلطان سلیم اوّل نے اسے تسخیر کیا۔ ایک کے بعد ایک سلطان کے نام کے خطبے یہاں پڑھے گئے۔ اور آخر ترکوں نے بھی گھوڑوں پہ زینیں کسیں اور رخصت ہو گئے۔ پھر ایک دھواں دھار جنگ ہوئی۔ پھر فرانسیسی ان گلیوں میں دندنانے لگے۔ لیکن یہ محرابیں یہ ڈیوڑھیاں یہ آثار کوئی نہ مٹا سکا۔ دمشق تو گنج شہیداں ہے چلو فاتحہ پڑھو۔ حضرت بلال حبشیؓ کے مزار پر۔ عبداللہ بن مکتومؓ کی تربت پر۔ عمر بن عبدالعزیز کی قبر پر۔ سیدہ زینب۔ سیدہ سکینہ۔ اسماء بنت ابوبکر۔ سیدہ فاطمہ صغریٰ بنت امام حسینؓ۔ ان قبرستانوں کے پھیلے ہوئے کھنڈروں میں کس کس موتی کو تلاش کرو گے۔ اور پھر ایک طرف سے تلاوت کی شیریں آواز آنی شروع ہوئی۔ اسے دمشق رخصت۔ اسے جامع اموی۔ اسے عظمت رفتہ کی سجدہ گاہ السلام۔ لیکن ابھی کہاں۔ ابھی تو دمشق کی گلیاں باقی ہیں۔ ہم نے سرک پاسکی اور درویش پاشا کی تربت کے پاس سے کاوا کاٹ کر پھر اندھی گلیوں کی محرابوں میں گم ہو گئے۔

جونیہ سے طرابلس تک

یہ بیروت ہے اور یہ بیروت میں ہماری آخری شام ہے اور خدا کو منظور ہوا تو ہمارے سفر کی آخری شام بھی۔ بیروت کا طوفانی سمندر دو راتوں سے بے طرح شور کر رہا ہے اور ہمیں اپنے ساحل پر بلا رہا ہے۔ جہاں آجکل شام کو دور دور تک کوئی متنفس نہیں ہوتا۔ گرمیوں کی شاموں کو یہیں ہم نے لوگوں کے میلے دیکھے تھے۔ تربوز، بھٹے اور نان بکتے پائے تھے۔ آج نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں۔ نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں۔ یا تو موسم کے ساتھ رخصت ہو گئیں، یا چار دیواریوں میں، دیوان خانوں میں محصور ہو گئیں۔

شام ہے۔ تاریکی ہے۔ ابر ہے۔ بوندیں برس رہی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے بادل بھی گرج اٹھتا ہے اور اس طوفان کے باوجود دور ابر کی دو ٹکڑیوں کے درمیان سے جانے کس تاریخ کا چاند جھانک

رہا ہے۔

وہ سامنے حریصا کی پہاڑیاں نظر آتی ہیں اور اس کے دامن میں جونیہ قریہ ہے جہاں ہم نے پچھلے ہفتے ایک دن گزارا تھا۔ مس علا الشیخی کہ یہاں ہماری رفاقت پر مامور ہیں اپنی کار لے آئی تھیں اور منزل ہماری المکتبۃ البولسیہ تھی یعنی سینٹ پال پبلشنگ ہاؤس۔ سینٹ پال ہوٹل سے سینٹ پال مکتبے تک.... جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ سوئے دار کی رعایت سے اس مکتبے کی چھت پر صلیب بھی نصب تھی۔ اور اس کے پیچھے کا پہاڑ بھی کلیساؤں اور صلیبوں سے پٹا تھا اور حریصا کے پہاڑ کی چوٹی پر ایک عیسائی دیوی کی بہت بڑی شبیہہ تھی جس پر رات کو اس انداز سے روشنی ڈالی جاتی ہے کہ سارے میں یہی جھلملاتی دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے گرجاؤں کی صلیبیں بھی رات کو روشن ہو جاتی ہیں۔ کسی مسجد کا مینار ان پہاڑیوں پر ہمیں نظر نہ آیا۔

جونیہ میں ہم نے عین کنارِ بحر پر مہربان اور شفیق اور سیہ پوش فادر جورج بالکی کے ساتھ کھانا کھایا اور لسّی پی۔ ہماری نظر جو فرازِ کوہ کی طرف اٹھی تو بولے۔ چلو گے اوپر؟ ہم نے کہا: کیسے؟ بولے۔ بجلی کے جھولے میں بیٹھ کر۔ جھولے میں بیٹھ کر لوہے کے تاروں سے لٹکے پہاڑ چڑھنے اترنے کے مواقع ہمیں جاپان میں بھی ملے اور سوئٹزرلینڈ میں بھی۔ لیکن ہم نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا۔ یہاں ہم نے اپنا جی کڑا کیا اور کہا: ہاں کیوں نہیں۔ فادر بالکی کے ایک جوان ساتھی نے جھولے میں چڑھنے سے انکار کر دیا کہ مجھے تو ہول آتا ہے۔ مس علا الشیخی ہچر مچر کرتے ہوئے شرماشرمی ہمارے ساتھ سوار ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب انہوں نے نیچے جھانکا اور زمین کو سخت آسمان کو دور پایا تو اُن کا دل بھی ڈوبنے لگا۔ اور خوف کے مارے ہمارا ہاتھ پکڑ کر ہم سے سمٹ کر بیٹھ گئیں۔ یہ مقام تھا

الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے

کی دُعا کا تھا۔ لیکن ہم جو جہاز میں بیٹھے کبھی نہ گھبرائے تھے۔ یہاں محض فادر اور مس علا کو دکھانے کے لیے ہنس ہنس کے باتیں کرتے رہے۔ سچ یہ ہے کہ دل ہمارا بھی بیٹھا جا رہا تھا۔ چڑھائی اتنی زیادہ اور مسافت ایسی خاصی ہے کہ اُوپر سے یہ بھی مشکل سے نظر آتا تھا کہ ہم کہاں سے چلے تھے۔ اب ہم قلۂ کوہ پر تھے۔ فادر ہمیں پاس کے گرجا میں لے گئے جس کے اُوپر لبنان کی سب سے بڑی مورتی ہے۔ اسے شہر بیروت کی محافظ کہا جاتا ہے۔ یہ گرجا عجیب و غریب ساخت کا تھا اور یہاں سے گرد و نواح میں بیس میل دُور تک دیکھا جا سکتا تھا۔ فادر نے صلیب کا نشان بنایا۔ ہم ہلال والے کھڑے دیکھتے رہے۔

جن پبلشروں سے ہم ملے اور بیروت کے پبلشر تو ایک صدی سے مشہور ہیں، ان میں سے بیشتر عیسائی ہیں، انہی نے پرانا عربی ادب چھاپا ہے اور اسلامی کتابیں بھی۔ یہ لوگ لبنان کے نولکشور ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ یہ کتابیں بہت خوبصورت چھاپتے ہیں۔ مولوی محبوب عالم نے اپنے سفرنامے میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ وہ مطبع الکاتولیکیہ اور مطبع آبائے یسوعئین میں گئے تھے اور ڈھیروں کتابیں خریدی تھیں۔ ہماری عربی کسی قابل نہ تھی پھر بھی ہم نے کچھ کلاسیکی شاعروں کے دیوان لیے۔ دیکھ کر آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔ بیروت کے دوسرے کاروباریوں کے بورڈ پڑھیے تو بھی غالب اکثریت عیسائیوں کی نظر آئے گی۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ ان کا تناسب اب عیسائیوں کے برابر ہے۔ مولوی محبوب عالم نے ۱۹۰۰ء میں لکھا تھا کہ شہر میں مسلمان فقط ایک چوتھائی ہیں۔ عربی زبان سے محبت اور اسرائیل کی مخالفت میں ہم نے ان عیسائیوں کو مسلمانوں سے کم شمشیر برہنہ نہیں پایا۔

اگلے روز اسی راستے ہم طرابلس گئے تھے۔ طرابلس دو ہیں۔ ایک طرابلس الغرب جو لیبیا میں ہے اور ایک یہ کہ امتیاز کے لیے طرابلس الشام کہلاتا تھا۔ یہ لبنان کے انتہائے شمال میں ہے۔ اس کے بعد شام کی سرحد پار کریں تو حلب کے نواح میں جا پہنچیں گے۔ اسی ساحلی سڑک پر جونیہ سے کچھ آگے ببلوس کا قدیم شہر ہے۔ جہاں دنیا کے پہلے حروف تہجی ایجاد ہوئے اور زبان نے تحریر کا روپ پایا۔ لبنان قدیم زمانے میں فونیشیا کہلاتا تھا۔ اور یہاں کے لوگ فنیقی دنیا کی قدیم تہذیبوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ یہ سمندری طاقت تھے اور ان کے سفینے روم اور کارتیج تک مار کرتے تھے۔ ببلوس کے نئے شہر کے پہلو میں پرانے آثار میں سے کچھ تو چار اور پانچ ہزار سال پہلے کے مندروں کی باقیات ہیں جن کے گرد تین ہزار سال قبل مسیح کی فصیل کا کچھ حصہ اب بھی کھڑا ہے۔ عین ساحل پر ایک فرنگیش قلعہ ہے صلیبیوں کے زمانے کا۔ ولادت مسیح سے چار ہزار سال قبل یہ شہر سواحل فونیشیا کا دارالحکومت تھا اور بائبل کا نام اس شہر کے نام ببلوس سے مشتق ہے۔ اسے دنیا کا قدیم ترین شہر بھی کہتے ہیں۔

طرابلس کہ اصل میں تریپولی یعنی تین شہر ہے۔ قدیم زمانے میں

صدر، صید، اور ارواد تین شہروں کے مہاجرین نے آباد کیا تھا اور ہر جماعت علیحدہ محلہ اور فصیل کے اندر رہتی تھی۔ رومیوں کے عہد میں یہ بڑا اسر بر آوردہ شہر تھا اور مسلمانوں کے عہد میں بھی، یہاں سے ریشم اور برتن دساور کو جاتے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور سلطان بیبرس نے اس کا محاصرہ کیا۔ آخر سلطان قلاون نے اسے فتح کیا۔ یہاں صلیبی زمانے کا ایک قلعہ۔ ۷ جامع۔ بہت سے پرانے مدرسے اور کتب خانے۔ بارہ پرانی عیسوی خانقاہیں اور تجارت کے بازار ہیں۔ نیا طرابلس تو جدید شہر ہے لیکن پرانا شہر اپنے مکتبوں، جامعوں اور محراب دار گلیوں کے ساتھ چھوٹا دمشق کہلانے کا مستحق ہے۔

ہم قلعے کے دروازے پر پہنچے تو اسے بند پایا۔ کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ ان کی زبان ہمارے اور ہماری ان کے پلے نہ پڑی۔ اتنے میں ایک نوجوان باسکٹ پہنے آتے دکھائی دیے۔

ہم نے پوچھا، انگریزی بولتے ہو؟

جواب ملا: ہاں بولتا ہوں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ ان کی انگریزی آٹھ دس لفظوں تک محدود تھی۔ نام ان کا احمد تھا۔ بولے اُردو بھی بول لیتا ہوں۔ ہم نے کہا: 'بولو' فرمایا: "بہت اچھا"۔ پتہ چلا کہ ان کو یہی لفظ آتا ہے۔ "بہت اچھا" جانے کہاں سے سنا تھا۔

یہ بیچارے بہت بھلے آدمی تھے۔ انہوں نے قلعے کے دروازے پر جا کر بابا علی کو بہت آوازیں دیں لیکن آج بابا علی نے پہلا روزہ ہونے کی وجہ سے جلد دروازہ بند کر دیا تھا۔ احمد میاں نے کہا: اب آپ شہر جائیے، چھ بجے کے بعد آئیے اُس وقت بابا علی کا جی چاہا تو آپ کے لیے دروازہ کھول دے گا۔ آپ ایک آدھ لیرا نذر کریں تو دروازے کا کھلنا بڑی حد تک یقینی ہے۔

ہم نے کہا۔ اچھا، اب ہمیں بازار کا رستہ بتاؤ۔ بازار تو ہم پہنچ گئے لیکن وہ بھی بند ہو رہا تھا۔ طرابلس کی یادگار کے طور پر ہم نے کچھ خریدنا چاہا۔ سامنے کمبلوں کی دکان تھی۔ ہم نے ایک کمبل لیا۔ بھاؤ تاؤ کی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ دکاندار افطار کے لیے گھر جانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا، بھاؤ تاؤ کرنا ہے تو کل صبح آئیو۔ ناچار ہم نے پیسے دیے اور کمبل کو بغل میں مارا۔ یہاں میاں احمد بھی سلام علیک کر کے ہم سے رخصت ہو گئے۔ اور ہم طرابلس کی گلیوں میں گھومنے کے لیے تنہا رہ گئے۔

اس مسافت میں ہمارا کمبل بہت خلل انداز ہوا۔ ہم اسے ایک بغل سے دوسری میں منتقل کرتے رہے حتیٰ کہ ایک بار تو ہم اسے چھوڑنے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے لیکن اب یہ ہمیں نہ چھوڑ رہا تھا۔ طرابلس میں دیکھنے کی چیزیں تو بہت ہیں لیکن وقت کہاں تھا۔ مدرسوں اور مسجدوں اور محرابی بازاروں میں تو ہم جھانکے اور دُور دُور تک گئے لیکن قلعہ نہ دیکھ پائے۔ معلوم ہوا صبح دم دروازہ خاور کھلے گا تو یہ بھی کھلے گا۔

چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چودیس۔ یہ تین مہینے بڑی مشکل سے تمام ہوئے ہیں اور ہم بغداد کا پروگرام منسوخ کر کے سیدھے کراچی آ رہے ہیں کیونکہ اے ہماری کلفتوں، عشرتوں اور حسرتوں کے شہر، ہم تجھ سے دُور نہیں رہ سکتے۔ آوارہ گردی سے ہم نے اپنے دامن میں دیس دیس کی خاک تو جمع کر لی ہے لیکن ہمارے درد وہی ہیں کہ جو تھے۔ اور درماں وہی ہیں کہ جو تھے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی دیکھا۔ یہ دریائے سین ہے۔ یہ ٹیمز ہے۔ یہ رین ہے۔ یہ رائن یہ ایمسٹل۔ یہ رہی جنیوا کی جھیل۔ اور یہ ہے زیورخ کا بحیرہ۔ دریائے دتاوا۔ دریائے وستا۔ دریائے ڈینیوب۔ دریائے نیل اور اب بحیرۂ روم، پانی ہی پانی، اس کے باوجود پیاس ہی پیاس۔

یہ کیا صدا کانوں میں آ رہی ہے۔ گرجا کا گھڑیال ہے۔ یا بانگِ رحیل ہے۔ اے مسافر اپنے آخری پڑاؤ سے اُٹھ۔ الاؤ بجھا اور کجاوے میں زادِ سفر رکھ کہ آج تیرا قافلہ جاتا ہے اے بلادِ مغرب کے شہرو، خدا حافظ۔ اے پیرس کے چوکو۔ لندن کی گلیو۔ برلن کی سڑکو۔ ایمسٹرڈم کے بازارو۔ جنیوا کے منارو۔ برن اور لوسرن کے سبزہ زارو۔ پراگ کے قلعو۔ وارسا کے خرابو۔ ویانا کی محلسراؤ۔ قاہرہ کی مسجدو۔ دمشق کے مکتبو اور طرابلس کی محرابو الوداع اور بیروت کی روشنیو تمہیں بھی الوداع۔

آج ہم اپنے سفر کی بارہویں ولایت اور ستائیسویں شہر کو خیرباد کہیں گے۔ اے وقت تیز تر کی گام زن۔ اے گھڑی کی سوئیو چلو چلو چلو۔ نسیم خوشدلی از فتح پور می آید۔ بس ایک شام اور درمیان ہے۔ پھر ہم اپنی کمر کھولیں گے۔ جوتوں سے ان رہ گزاروں کی گرد جھاڑیں گے۔ مسافر کے دنوں اور ہم سفروں اور مہربانوں اور میزبانوں کو یاد کریں گے ہوتے ہوتے بھول جائیں گے۔

چل خسرو گھر اپنے

ایک بار ہمارے دوست ممتاز مفتی کے راولپنڈی سے کراچی آنے کا پرچہ لگا تو ہم نے اور احمد بشیر نے ان کے خیر مقدم کے لیے لارنس روڈ سے کلن بینڈ والے کا باجا کرائے پر لیا۔ پوری ٹیم لینے کی تو مقدرت نہ تھی۔ نہ ہمیں خود ڈھول پیٹنا اور نفیری بجانا آتا ہے۔ بس ایک آدمی کی فیس دی۔ اس نے ٹرنت ٹھیلے میں سے نکال کر اپنی زرق برق جھالردار یونیفارم زیب تن کی اور ہمارے ساتھ ہو لیا۔ یہ باکمال ایک ہاتھ سے ڈھول بجاتا تھا۔ دوسرے میں ترم پکڑے تھا۔ یہ تو دو ساز ہوئے، یورپ میں تو جہاں لیبر مہنگی ہوتی ہے گلے میں تاشہ کہاروں کے پالکی میں ڈھول کا حساب ہمیشہ رہتا ہے۔ ایک آدمی تین تین چار چار باجے ایک ساتھ بجاتا ہے۔ منہ والا باجہ ہاتھ سے پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ ڈھول کے ساتھ ایک کمانی لگی ہے اس میں وہ اٹکا رہتا ہے۔ ایک ذرا گردن جھکائی اور پھونک لگائی۔ اب دونوں ہاتھ فارغ ہیں۔ ایک سے ڈھول پر چوٹ لگا دیے۔ دوسرے سے جھانجھ بجا دیے یا سر کھجا دیے۔ بہرحال ممتاز مفتی صاحب اس جلوس میں اس ایک نفیری بینڈ کے پیچھے دولہا بنے جو چلے تو یہ منظر دیدنی تھا ہوائی اڈے کے سارے مسافر دیکھنے کو جمع ہو گئے کہ اس کروفر سے یہ کس کی سواری بادبہاری جاتی ہے۔

یہ اعزاز ہماری نظر میں پنڈی سے آنے والوں کا تھا۔ ہم تو پھر ولایت سے آرہے تھے اور یاروں دوستوں کو لکھ دیا تھا کہ دیکھنا زیادہ تکلف نہ کرنا۔ یہ زیادہ ہار گجرے ڈھول تاشے سپاسنامے وغیرہ ہمیں پسند نہیں۔ اگر ہوں تو بس ایک حد کے اندر ہوں۔ زندہ باد کے نعرے لگانے والوں کا جلوس بھی زیادہ سے زیادہ ایک بس میں آجائے۔ ہم گوشہ گیر فقیر آدمی ہیں۔ زیادہ طمطراق ہماری درویشانہ طبیعت کے منافی ہے۔ جنگ والے، ڈان والے اور ٹیلی ویژن والے بھی بس ایک ایک فوٹوگرافر ہماری تصویر وغیرہ لینے کو بھیجیں۔ ہجوم سے ہمارا جی گھبرا جاتا ہے۔

پھر واپس آنے والوں کے خیر مقدم کے کئی طرح کے کلمات ہم نے پڑھے اور سنے تھے۔ خوش آمدید۔ صفا آوردید۔ اے آمدنت باعث آبادیِ ما ـــــ سروسوئے بوستان آید ہے۔ اہلاً وسہلاً۔ جی آیاں نوں وغیرہ۔ ہمارا دل بھی کراچی کے قریب پہنچ کر گداز ہو گیا تھا اور ہم نہایت رقت سے آیا شہر جھنجھوسا آیا شہر جھنجھرنی گاتے اور آنسو پونچھتے چلے آرہے تھے۔ اس بے تکلفی کا بُرا ہو۔ اوّل تو احباب میں سے کوئی ہوائی اڈے پر آیا نہیں، آیا تو ہنکارا۔" جیسے گئے تھے ویسے ہی ہر پھر کے آگئے:" دوسرا بولا، خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ ایک شاعر نے تو ایک پرانے فارسی مصرعے ــــ "چہ بیاید ہنوز ــ الخ" سے تاریخ بھی نکالنے کی کوشش کی۔ غنیمت ہوا کہ نہیں نکلی۔

یہ سارا جی جلانے کا سامان تو تھا لیکن جب ہم نے پوچھا کہ گوبا جے کا جے کہاں ہیں۔ جلوس کدھر ہے۔ کیا ایک آدھ ہار بھی تم نہ لا سکتے تھے۔ پیسے ہم دے دیتے۔ یہ کیا تماشا ہے تو سب آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئے۔ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ خیر میاں آزاد۔ آج کل کے دوست ایسے ہی ہیں۔ ان کا گلہ نہ کرنا چاہیے۔

لیکن آنے والی جوشے کم آب کو سب سے پہلے کسٹم کے پلوں کے نیچے سے گزرنا پڑا۔ ہمارے پاس ایک سوٹ کیس تھا۔ ایک اور سوٹ کیس۔ ایک تھیلا۔ ایک اور تھیلا اور ایک اور تھیلا۔

کسٹم افسر نہایت مستعد آدمی تھے۔ فرمایا:

HAVE YOU ANYTHING TO DECLARE?

ہم نے کہا: "ہم خدا کو حاضر ناظر جان کر اعلان کرتے ہیں کہ گزشتہ را صلوٰۃ بقیہ عمر ملک اور قوم کی خدمت میں بسر کریں گے، خواہ اس کے لیے ہمیں اسمبلی میں کیوں نہ جانا پڑے۔"

بولے: "اس قسم کے اعلان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ کے سامان میں کوئی چیز ایسی تو نہیں جو قیمتی ہو جس پر کسٹم لگتا ہو۔"

ہم نے کہا: "کیوں نہیں۔ بڑی بڑی انمول چیزیں ہیں۔ ہم نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک چیز نکالی۔ یہ تھی انگلش جرمن اور جرمن انگلش ڈکشنری۔

بے توجہی سے دیکھ کر فرمایا: "اور کیا ہے؟"

اب کے ہم نے ہاتھ ڈالا تو فرنچ انگلش اور انگلش فرنچ ڈکشنری دستیاب ہوئی۔

فرمایا: "اس کے نیچے کیا ہے؟"

وہاں سے ڈچ زبان کی لغت برآمد ہوئی۔

اب انہوں نے تھیلا لے کر خود ٹٹولا۔ اس کے نیچے چیک زبان کی لغت تھی۔ پولش زبان کی روزمرہ بول چال کی کتاب تھی۔ اٹالین زبان کی گرامر تھی۔

بولے: "بس؟"

ہم نے کہا: "بس کیوں۔ عربی زبان کے لغات اس دوسرے تھیلے

میں ہیں۔ ان کے علاوہ ہر شہر کی گائیڈ بک، نقشے اور پکچر کارڈ ہیں، دکھائیں نکال کر؟

بولے "نہیں"۔

اب انہوں نے ہمارے سوٹ کیس کو ٹھوکا دیا اور کہا یہ بھی ذرا دیکھیں۔

وہاں بس کچھ کپڑے تھے ہمارے۔ کچھ پرانے کچھ نئے۔ دُھلی اَن دُھلی بنیائیں۔ موزے وغیرہ۔ مولوی محبوب عالم کا سفرنامہ۔ ہمارا غیر مطبوعہ دیوان۔

ایک ڈبہ ہم نے ان کپڑوں کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ ہمارا خیال تھا اس پر کسی کی نظر نہ جائے گی لیکن کسٹم والوں کی نگاہیں بہت تیز ہوتی ہیں۔ انہوں نے اسے کھینچ لیا۔ ہم نے کہا۔ نہ نہ۔ اسے مت کھولئے گا۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے لیکن انہوں نے کھول ہی لیا۔

اس ڈبے کے اندر سے ایک اور ڈبہ نکلا — اس کے اندر ایک اور — ایک اور — اب لفافے شروع ہو گئے ایک کے اندر دوسرا — دوسرے کے نیچے تیسرا — بڑے لفافے — درمیانے لفافے — چھوٹے لفافے — سب سے اندر کا لفافہ انہوں نے کھولا۔ اس میں کچھ بھی نہ تھا۔

فرمایا: اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔

ہم نے کہا: کیوں نہیں ہے؟ آنکھوں والوں کے لیے بہت کچھ ہے۔ ہم سے پوچھئے، ہم جاتے ہوئے اپنے ہاں کی ہینڈی کرافٹ شاپ سے کچھ تحفے لے گئے تھے، ان لوگوں نے اخبار میں یا براؤن پیپر میں باندھ کر دیے تھے، ہمیں بہت شرم آئی، اب یہ دیکھئے، یورپ والے کتنی عمدہ پیکنگ کرتے ہیں۔ اس ڈبہ میں ہمارا سوٹ تھا اس دوسرے میں جوتا تھا۔ باقی لفافوں میں ہماری قمیضیں اور سویٹر وغیرہ تھے۔ اس لفافہ میں ہم ایک بار ڈبل روٹی لائے تھے۔ لوگ تو ایسی چیزیں بے پروائی سے پھینک دیتے ہیں ہمارے جی نے یہ گوارا نہ کیا۔ سینت سینت کر رکھتے رہے۔ اب یہ چیزیں ہم اپنے دکانداروں کو دکھائیں گے اور شرم دلائیں گے کہ تم لوگ ایسے ڈبوں اور لفافوں میں چیز رکھ کر دیا کرو تو ہم کیوں نہ لیں۔ جب ہم ولایت میں اتنی ڈھیر ساری خریداری کرتے ہیں تو یہاں کے دکاندار تو پھر اپنے بھائی ہیں، اپنے گرائیں ہیں..... یہ سارے ڈبے اور لفافے جمع کرنے اور رکھنے میں ہمیں اتنی محنت کرنا پڑی۔ جرمنی سے، انگلستان سے، ہالینڈ سے، سوئٹزرلینڈ سے اور آپ نے ٹکا سی زبان ہلادی کہ اس میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ جیسے یہ سب ردّی چیزیں ہوں۔

فرمایا: جائیے، صاحب جائیے،

ہم نے کہا: یہ تیسرا تھیلا بھی دیکھ لیجئے!

بولے: نہیں، نہیں، نہیں، نہیں — جائیے۔ ہوا یہ کہ ایک اور صاحب آکر ان کے کان میں کہہ گئے کہ یہ تو فلاں صاحب ہیں۔ کیوں اپنا وقت ان پر ضائع کرتے ہو یہ بھی اچھا ہوا۔ کیونکہ ہمارے تمام ہیرے اور زمرد، پونڈوں اور ڈالروں کے نوٹوں کی گڈیاں، سونے کی اینٹیں، جڑاؤ گھڑیاں، سلک کے تھان، افیم اور کوکین وغیرہ کے ڈبے اسی تھیلے میں تھے۔

ڈائری لکھنے اور چھپوانے کا فائدہ یہ ہوا کہ احباب کو اپنے متعلق عجیب طرح متفکر پایا۔ روتی صورتیں، سوکھے چہرے، ہمدردی لبوں پر۔ معلوم ہوا ہماری فلاکت اور بے زری کا سن کر بعضوں نے تو ہمارے لئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا ہے۔ ابن انشا ریلیف فنڈ کھول دیا ہے جس میں دیے جانے والے عطیات پر انکم ٹیکس بھی معاف رہے گا۔ بعض اہل درد دکانداروں اور چائے خانوں والوں نے بھی جو جنگ پڑھتے ہیں۔ از خود ہمارے نام کی صندوقچیاں کونٹر پر رکھ دی ہیں۔ جن لوگوں سے ہمیں اس قسم کے تقاضے کا کھٹکا تھا کہ ہمارا ٹیپ ریکارڈ کدھر ہے، ہمارا کیمرہ نکالو وغیرہ انہوں نے بلائیں لے کر اور آنسو پی کر کہا۔ میاں تم آگئے ہو سب چیزیں آگئیں۔ بلکہ ایک مہربان نے تو ہماری دلجمعی کے لیے ایک ٹرانزسٹر بھی بازار سے خرید کر ہماری نذر کیا ہے۔

ڈاکٹر محمد اجمل

چند روز فرانس میں

۲۷ر اپریل ۱۹۷۴ء

رات پونے گیارہ بجے ایئر فرانس کے طیارے میں سوار ہوا اور صبح فرانس کے وقت کے مطابق کوئی ساڑھے چھ بجے پیرس پہنچا۔ سفر خاصا خوش گوار گزرا اور نشست کی بلک کی وجہ سے تہران سے روم تک سوتا آیا، لیکن بار بار جہاز کے CRASH کا خیال آتا تھا CRASH کے خوف سے فرار بھی کرتا رہا، لیکن جب اسے پوری طرح محسوس کیا تو خوف بہت حد تک بے معنی معلوم ہونے لگا۔ کارل راجرز کا نظریہ کہ احساسات کو پوری طرح محسوس کرنا چاہیئے اور جو شخص اپنے احساسات و جذبات کو قبول کرتا ہے وہ انہیں دوسروں پر حاوی نہیں کرتا بہت صحیح نظر آتا ہے لیکن محسوس کرنے کے بعد افکار کی تصحیح بھی کرنی چاہیئے۔ ہمارے اندر ہر وقت جو تحت اللسان بات چیت ہوتی رہتی ہے اس کا شعور حاصل کر کے افکار کو صحیح کر لینا چاہیئے۔ اس طرح کچھ جذباتی صحت میسر آجاتی ہے۔

پیرس پہنچا تو یہاں کے دفتر خارجہ کی ایک نمائندہ خاتون میرے خیر مقدم کو ہوائی اڈے پر موجود تھیں۔ پاکستانی سفارت خانے کے ایک تھرڈ سیکرٹری مسٹر جاوید چوہان بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ سفارت خانے کی کار میں اوڈین ہوٹل پہنچے تو پتہ چلا کہ کمرہ نمبر ۲۰۸ جو میرے لیے ریزرو کیا گیا تھا بارہ بجے سے پہلے خالی نہیں ہوگا، چنانچہ میں موسیٰ جاوید چوہان کے ساتھ اس کے فلیٹ میں چلا گیا۔ یہ نوجوان بہت شریف اور مہمان نواز تھا۔ گورنمنٹ کالج کا سابقہ طالب علم تھا، بہت محبت سے پیش آیا، استاد اور شاگرد کے رشتے میں جو حجاب ہوتا ہے وہ مانع آتا رہا اور کچھ بے تکلفی سے اور کچھ جھجک سے میرے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اس نے اپنا کمرہ میرے لیے خالی کر دیا اور میں کوئی ساڑھے گیارہ بجے تک سوتا رہا۔ اس کے بعد چلتے پی اور میں اوڈین ہوٹل میں آگیا۔ کمرہ نمبر ۲۰۸، کمرہ کیا ہے اٹھارویں صدی کے آثار میں سے ایک تنگ و تاریک کمرہ جس میں ایک بہت بڑے پلنگ نے ساری جگہ گھیر رکھی ہے۔ دیواروں کو اس قدر قریب دیکھ کر زندانی ہونے کا احساس ہوتا ہے اور ضیق النفس کی شکایت پیدا ابھرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ میں اس کمرے میں رہنے کو اپنی ذلت سمجھنے لگا۔

رات بھر اپنے میزبانوں پر غصہ آتا رہا کہ مجھے یہ معمولی سا کمرہ دیا ہے۔ یہ کہاں کی مہمان نوازی ہے! سویا بھی خوب، بہت خواب آئے جن میں سے فقط یہ یاد ہے کہ ایک فرانسیسی عورت، اور میں ایک کار میں جا رہے ہیں اور ایک چھوٹا سا لڑکا کار چلا رہا ہے۔ ایک جگہ سڑک خراب ہے اور وہ لڑکا بائیں طرف موڑ کر ایک پہاڑی پر کار کو لے جاتا ہے اور پھر نہایت خطرناک طریقے سے پہاڑوں سے نیچے کار کو لاتا ہے۔ پہاڑی پر سے اترائی بالکل سیدھی ہے لیکن وہ بہر حال کار کو نیچے لے آتا ہے اور میں اس لڑکے کو بہت ڈانٹتا ہوں۔ صبح جب اٹھا تو ماحول سے خفگی بہت حد تک ختم ہو چکی تھی اور میں نے نیچے SALON میں جا کر ناشتہ کیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ آگیا ہے۔ یہی کمرہ اب اچھا لگنے لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ پہلے یہ کمرہ اس لیے تو بُرا نہیں لگا تھا کہ پاکستانیوں میں جگ ہنسائی ہوگی تو یہ میرا اپنا احساس تو نہیں تھا کہ کمرہ بُرا ہے۔ رتبے کا احساس لوگوں کی توقعات کا احساس ہے اپنا ذاتی احساس تو نہیں ہے یہ TNTROJECTS کس طرح دماغ میں سما جاتے ہیں۔ کہیں فرانس آنا بھی کسی INTROJECT ہی کی بدولت تو نہیں تھا۔ کہ لوگ رشک کریں گے کہ فرانس گیا ہے۔ فرانس کی کشش دل کی تہہ میں یہ تھی کہ MICHEL VALRAN احمد ابوبکر سے ملوں گا، اور ان سے روحانی فیض حاصل کروں گا اور اس طرح شاید اپنی بکھری ہوئی شخصیت میں کسی قدر جمعیت پیدا ہو اور سکون سے آشنا ہو جاؤں لیکن سب لوگ یہ سمجھتے ہیں اور اپنی بیوی اور بچوں کو بھی میں معقول وجوہات بتاتا رہا کہ وہاں یونیورسٹیاں دیکھنا ہیں، مدرسے دیکھنا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح ہر داخلی کشش کو میں لوگوں سے پوشیدہ رکھتا ہوں کیونکہ اگر انہیں معلوم ہو گیا تو وہ مجھ پر ہنسیں گے اور یہ عجیب سی بات ہے کہ جب لوگ مجھ پر ہنسیں تو مجھے سب سے پہلے اپنے جسم کی کم قدری کا احساس ہوتا ہے گویا یہ جسم حقیر ہے سکڑ گیا ہے ـــــ اور اس کے

بعد اپنے ذہن کی تحقیر کا۔ اگر مغرب کا جرم یہ ہے کہ اس نے روح کو نظر انداز کیا تو ہم نے اپنے آپ پر یہ ستم کیا کہ ہم نے جسم کو شعوری طور پر ایک حقیر مقام دیا۔

۲۸ اپریل ۱۹۷۴ء شام پونے آٹھ بجے

کوئی پانچ بجے ہوٹل واپس آیا۔ فرانسیسی عورت صبح پونے دس بجے کار میں لینے آئی۔ ہم پریمیئر ہوٹل گئے اور وہاں ایک جاپانی پروفیسر تمیا اور ان کی بیوی کو ساتھ لیا اور ہم سیدھے CHANTILLY گئے۔ جو پیرس سے کوئی چالیس کلو میٹر دُور ہے۔ بہت دلکش اور دلفریب جگہ ہے۔ ایک عظیم عمارت ہے جس میں ایک محل بھی ہے اور ایک قلعہ بھی ہے۔ دیواروں پر جا بجا فرانس کے مصوّروں کے شاہکار آویزاں ہیں۔ ڈیوک ڈی ایمول کا بہت بڑا اور جامع کتب خانہ ہے جس میں غالباً تیس ہزار کتابیں سجی ہوئی ہیں جن کی مرصع اور قیمتی جلدیں ہیں۔ یہ ڈیوک اکیڈمی آف سائنس کے علاوہ فلسفہ کی اکیڈیمیوں کا رکن بھی تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کو یہ اعزاز کیوں کر حاصل ہوئے اس عمارت کا ایک حصہ COLLEGE DE FRANCE کے بڑے بڑے پروفیسروں کی رہائش کے لیے مخصوص ہے کہ وہ جب چاہیں یہاں آ کر کام کریں۔ علم و فضل کی یہ قدر دانی دیکھ کر خیال آیا کہ جب تک اس تہذیب میں یہ عناصر موجود ہیں یہ مردہ نہیں ہو سکتی۔ اس محل کے ساتھ ایک بڑی شکارگاہ بھی ہے۔ لوگ یہاں آ کر گھوڑ دوڑ کا تماشا کرتے ہیں۔ یا خود گھوڑے کی سواری کرتے ہیں اور شکار کے موسم میں شکار کھیلتے ہیں۔ یہاں نہایت عمدہ اور خوش ترتیب باغ لگے ہوئے ہیں جن میں کئی رنگوں کے لالے کے پھول کھلے ہوئے ہیں اور باغوں کے بیچ میں پانی کے چشمے بہتے ہیں۔ بہت حسین اور دلفریب منظر تھا۔ روح میں ایک شادابی سی محسوس ہونے لگی، جی چاہتا تھا کہ اس فضا کو اپنا آپ سپرد کر کے حُسن کے ہر منظر سے لپٹ جاؤں۔ شاید اسی چند لمحوں کی کیفیت کو دائمی تجربہ کہتے ہیں، جس طرح محبوب سے چند لمحوں کی ملاقات ابدی اور ازلی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ واپس آنے لگے تو باہر دُور لمبے لمبے درخت نظر آئے جنھوں نے اپنے چمکیلے پتوں سے سڑک پر سایہ کر رکھا تھا ان پتوں کی سبزی میں ایک اُجالا، ایک آب و تاب تھی جو ابر آلود فضا میں دمک رہی تھی اور ابھی ہم وہاں سے نکلے ہی تھے کہ دھوپ نکل آئی ہوا کی خنکی کم ہوئی اور بہار آ گئی۔ ہمارے رہبر نے کہا، چلو آپ لوگوں کو SENLIS دکھلاؤں۔ ہم نے کہا، چلو۔ کوئی دس میل کے فاصلے پر یہاں ایک اُجڑا ہوا گاؤں ہے جس کے پُرانے گھروں اور دیواروں اور اونچے دروازوں میں گویا اُن کے مرحوم باسیوں کی دُنیا باہر کی دُنیا سے پوشیدہ آباد تھی۔ ایک جگہ کار کھڑی کی اور ہم ٹہلتے ٹہلتے ایک عظیم اور بلند قامت کلیسا کے پاس جسے NOTRE DAME OF SENLIS کہتے ہیں آن نکلے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں جون آف آرک نے انگریزوں کو شکست دی تھی۔ اس کے سامنے یہ کلیسا ہے جس کے ایک بڑے دروازے کی محراب پر بہت سے صنم تراشے ہوئے ہیں۔ مرکزی صنم حضرت مریمؑ کی موت کے واقعے کو بیان کر رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کا صنم بھی ہے اور دونوں طرف مختلف مقدس شخصیتوں کے اصنام ہیں۔ کلیسا کے اندر گئے تو ایک خاص قسم کا سادہ جلال و جمال نظر آیا۔ کلیسا کیا تھا فرانس کا ایک راہب تھا جو ہیبتِ ایزدی سے مسحور کھڑا تھا۔ ہم جیسے تماشائی اسے دیکھتے اور اس کے وقار کو اپنے ذہنی اثاثے کے مطابق اس کی تعبیر کر کے چلے جاتے۔

باہر نکلے تو پروفیسر تمیا نے کہا، بھوک لگی ہے یہیں کھانا کھا لیں۔ وقت دیکھا تو ایک بج چکا تھا اور بھوک بہت لگ چکی تھی۔ معجزۂ فن کے ان مظاہر میں اس قدر انہماک تھا کہ بھوک کی آگاہی نہ تھی۔ ہم کوئی معقول ریسٹوراں ڈھونڈنے لگے۔

۲۹ اپریل ۱۹۷۴ء صبح سوا نو بجے

دو صفحے سے زیادہ لکھنے کی ہمت نہیں ہوتی ورنہ جو گفتگو کھانے پر ہوئی وہ بہت دلچسپ تھی اور اسے محفوظ کرنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ پھر لکھوں گا، اس وقت رات کا خواب لکھ لوں۔ رات میں نے خواب دیکھا کہ ایک ضروری اجلاس قائم کرنا ہے اور اس کا اہتمام میرے ذمہ ہے۔ وہ اہتمام مکمل ہو جاتا ہے لیکن اس سلسلے میں بہت سی دشواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ دوسرا حصہ خواب کا یہ تھا کہ اختر (میری بیوی) ابھی میرے ساتھ ہے اور ایک کھویا ہوا بچہ بھی۔ خواب کا مطلب میں نہیں سمجھنا چاہتا۔ صرف اتنا جانتا ہوں کہ

وہ کھویا ہوا بچہ میری انا ہے جو کسی بھول بھلیوں میں کھو گئی ہے اور جو مقاصد اور اقرار کے الجھاؤ میں مبتلا ہے۔ کل پروفیسر تمیا کے ساتھ کھانے پر بڑی دلچسپ باتیں ہوئیں۔ پروفیسر تمیا کی باتوں میں بڑی خود اعتمادی تھی اور مزاح کی جھلک بھی تھی۔ وہ ہنستا بھی خوب کھلکھلا کے اور ہر جاپانی سیاح کی طرح بار بار کیمرہ اٹھا کر تصویر بھی لے لیتا تھا۔ اس کی بیوی کے چہرے پر ایک مستقل حیرانی کی کیفیت طاری تھی اور اس کے اپنے چہرے پر ایک نقاب —— سکون کا۔ جب جاپانیوں کی شخصیت کے بارے میں بات چیت شروع ہوئی تو میں نے وہ نقاب لرزتے دیکھا اور چہرے کی فطری زردی میں سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی، لیکن آہستہ آہستہ اس نے اپنے متعلق باتیں شروع کیں اور کھلتا گیا۔ فرانسیسی لڑکی نے کہا کہ جاپانی کام اتنا کرتے ہیں کہ وہ تفریح کو پسند نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ صنعت یافتہ ممالک میں لوگ اپنے آپ سے اس قدر خوف کھاتے ہیں کہ وہ چھٹی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ پروفیسر تمیا کچھ نفسیاتی توجیہہ کا قائل نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے میرے تبصرے کو نظر انداز کرنا چاہا لیکن نفسیاتی توجیہہ پر نفسیات دشمن لوگوں کا ردِ عمل ہمیشہ جذباتی ہوتا ہے۔ اگر ایسے وہ نظر انداز کریں گے بھی تو جذباتی ہو کر، گویا نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اور اس سے بے اعتنائی نہیں برت سکتے۔ برطانوی ماہر نفسیات آئزنک کو دیکھو تو تقریباً ہر موضوع پر کس قدر غیر جذباتی انداز میں اظہارِ خیال کرتا ہے اور کس قدر پھیکا اور بے رنگ ہے۔ اس کا طرزِ تحریر لیکن جونہی تجزیۂ نفس پر تنقید کرنے لگتا ہے۔ فوراً انداز میں تندی اور جوش ابلتا نظر آتا ہے۔ گویا کسی نے اس کی دکھتی رگ چھیڑ دی ہو تڑپ تڑپ کر لکھتا ہے اور اِدھر اُدھر سے دلائل جمع کرتا ہے اور اس طرح تجزیۂ نفس کو غلط ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اس میں سانس باقی نہ رہے اور اس کا جنازہ دھوم کے بغیر نکل جائے، لیکن اس طرح وہ کئی بار اس مدرسۂ فکر کا جنازہ نکال چکا ہے اور پھر بھی یہ مدرسہ زندہ ہے پروفیسر تمیا کی خود اعتمادی رشک آفریں تھی لیکن نفسیاتی تجزیہ کے ایک ہی وار سے وہ متزلزل ہو گئی۔ اس نے کہا کہ میں چھٹی اس لیے نہیں لیتا کہ مجھے کام بہت ہے۔ میں نے کہا کہ صنعت میں ترقی یافتہ ہونے سے انسان آہستہ روی کی لذتوں سے نا آشنا ہو جاتا ہے۔ وہ روح کی آواز سننے سے قاصر رہتا ہے کیونکہ خارجی دنیا کا شور و غوغا اس کی توجہ اپنی طرف کھینچے رکھتا ہے۔

۲۹ اپریل ۱۹۷۴ء

پروفیسر تمیا کی باتیں اور کلیسا کے حسن کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا تھا لیکن آج پروفیسر کلوڈ لیوی سٹراؤس سے کچھ باتیں ہوئیں۔ میں نے ان کی جو کتابیں پڑھی تھیں ان کا ذکر کیا۔ پھر میں نے پوچھا کہ ان کی کتابوں میں ژُنگ کا ذکر نہیں ہے۔ وہ کہنے لگے "ہاں، اس لیے نہیں ہے کہ ژنگ ایک تصور IMAGE کو علیحدہ کر کے اس کے معنی تلاش کرتا ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب ہر تصور سیاق و سباق میں ٹھیک طرح بیٹھ جائے تو پھر اس کا مطلب متعین ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا ژنگ بھی تو گویا اعیان کا ذکر کرتا ہے یعنی کوئی عین بذاتِ خود علیحدہ ظاہر نہیں ہوتا بلکہ مختلف اعیان سے مل کر معنی حاصل کرتا ہے۔ ہر عین "انا" کی ایک موجودہ حالت کے ردِ عمل کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ژنگ میں شاید الجھاؤ ہے کہ وہ کبھی عین کو "تصور" کہتا ہے اور کبھی تصور کی صورت کو" مجھے پروفیسر موصوف کی باتوں سے یہ احساس ہوا کہ انہوں نے ژنگ کو غور سے نہیں پڑھا۔ میں نے پوچھا کہ تیسری دنیا میں جو تشخص کا آشوب آیا ہے اس سے آپ بحیثیت ایک مغربی مفکر کے کیسے متاثر ہوئے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ جو غلطیاں ہم نے انقلاب فرانس کے وقت اور اس سے پہلے کی تھیں وہ تیسری دنیا کے لوگوں کو نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ ممکن ہے کہ آپ لوگ صنعت کو اپناتے ہوئے اپنے کلچر سے بیگانہ ہو جائیں۔ یہ بہت بڑی غلطی ہو گی۔ صنعت یابی اور تحفظِ ثقافت میں توازن قائم کرنا چاہئے۔ ہم لوگ آپ اپنی غلطی پر پچھتا رہے ہیں۔ پھر کہنے لگے کہ یہ ایک CARTESIAN غلطی ہے۔ میں نے سمجھا کہ شاید ڈیکارٹ نے جو روح اور مادے کی دوئی کو قطعی قرار دیا تھا اس کا ذکر کر رہے ہیں لیکن دونوں باتوں کا تعلق سمجھ میں نہ آیا۔ چنانچہ میں نے پوچھا کہ CARTESIAN کن معنوں میں؟ کہنے لگے کہ ڈیکارٹ نے چیزوں میں مماثلت ڈھونڈنی شروع کی تھی اور مماثلت کو اتنی اہمیت دی کہ لوگ چیزوں کے اختلافات کو فراموش کر گئے —— گویا

ہر کلچر کی ایک منفرد ساخت ہے۔ اس ساخت کا بیان اور اس کی پہچان اجتماعی علوم کا کام ہے۔ فوراً میرے دل میں اس نظریے کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ لیوی سٹراؤس کی فنکارانہ عظمت کا احساس بھی ہوا۔ میرے ذہن نے اس نظریے سے بغاوت اس لیے کی کہ یہ RUTH BENEDICT کے PATTERNS OF CULTURE کی طرح کا نظریہ ہے اور اس سے SPENGLER تک کی مسافت بہت مختصر ہے۔ ۱۹۶۳ء میں جب میں امریکہ گیا تو ماہر نفسیات نے ثقافتی اختلافات کو اس طرح ایک مذہبی سی حیثیت دے دی تھی کہ مجھے بہت کوفت ہوئی، چنانچہ میں نے اپنے ایک دوست HAROLD PEPINSKY پر جو اس نظریے کی بہت تبلیغ کر رہے تھے، اس کی لغویت ثابت کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ آج کلوڈ لیوی سٹراؤس کی عظمت کا میں اس طرح قائل ہوا کہ وہ ہر کلچر کو ایک فن پارہ سمجھتا ہے اور اس فن پارے کے بیان اور تجزیے ہی کو علم الانسان کا کام سمجھتا ہے لیکن وہ رویہ جو عمومی نتیجہ نہیں نکال سکتا اگر عمومی ہو جائے تو دنیا میں ایک ثقافتی انقلاب آجائے۔ اس رویے سے ہم ہر ثقافت کو ایک فن پارہ تصور کریں گے اور اس کے مختلف عناصر کو جوڑنے اور ایک سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے۔ یہ ایک جمالیاتی نظریہ ہے۔ سائنسی عقلی نہیں۔ اس نظریے کی رو سے عقل محض ایک ذیلی حیثیت رکھتی ہے ــــ ایک حاشیہ بردار کی حیثیت۔ یہ نظریہ اچھا تو لگتا ہے جمالیاتی نقطۂ نظر سے لیکن ہے رجعت پسندانہ۔ عقل مماثلت تلاش کرتی ہے اور اس تلاش میں مختلف ثقافتوں کے درمیان مکالمے کے امکانات دیکھتی ہے لیکن لیوی سٹراؤس کے ہاں "مکالمہ" ایک لایعنی چیز بن گیا ہے۔

لیوی سٹراؤس سے ملاقات کے بعد ایڈتھ کے ساتھ لکسمبرگ کے باغ میں سے گزرتا ہوا واپس ہوٹل پہنچا۔ لکسمبرگ کا باغ بہت دلکش مناظر لیے ہوئے ہے۔ چاروں طرف خوبصورت اور قدآور درخت ہیں اور سبزے میں ایک وثاقی تنوع ہے۔ بیچ میں ایک تالاب ہے جس کے گرد کچھ بچے کھیل رہے ہیں۔ شہر کے وسط میں اس قسم کے باغ شہریوں کو خود بخود اپنی طرف کھینچتے ہیں، بچوں پر جوڑے، بوڑھے اور جوان جوڑے بیٹھے تھے۔ ایک گوشے میں ایک لڑکی کرسی پر بیٹھی پڑھ رہی تھی اور ایک حبشی اسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مس ریشیماں نے کہا کہ یہاں اگر کوئی لڑکی اکیلی بیٹھی ہو تو کوئی نہ کوئی جوان لڑکا اسے تنگ کرنا شروع کر دیتا ہے یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں نے کہا کہ یہ آزادی کے خطرے ہیں۔ آزادی ایک فطری حق ہے لیکن اس حق کو نبھانے کے لیے ابھی انسانیت کو بہت سے دشوار مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ اسی طرح کی باتیں کرتے ہم ہوٹل تک پہنچے۔ وہاں سے مس ریشیماں اپنے دفتر چلی گئی اور میں کھانے کی تلاش میں۔

رات کو موسیو ورنان سے ملاقات ہوئی اور ان کے ہاں کھانا کھایا۔ بہت لطف آیا۔ موسیو ورنان ایک فاضل انسان ہے اور اس کی بیوی اس سے بھی زیادہ فاضل عورت معلوم ہوتی ہے وہ ASSYRIOLOGY کی ماہر ہے۔ اس نے مجھے اپنی تحقیقات کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں بتائیں۔ ایک کتاب جس کا نام "یونانی عہد میں جنگ کا تصور" ہے اس کی اور چند اور لوگوں کی تصنیف ہے ــــ اس نے کہا کہ بادشاہوں کی طاقت کے مختلف اظہار ہوتے ہیں۔ شیر اور بیل اس طاقت کی علامتیں ہیں۔ موہنجوداڑو میں جو شیر اور بیل ہیں وہ بھی اسی ملوکیت کا اظہار ہے۔ ان کا ڈرائنگ روم دنیا کے مختلف نوادر سے بھرا پڑا ہے۔ کہیں مہاتما بدھ کا مجسمہ ہے۔ کہیں انڈونیشیا کے ایک کچھوے کی شبیہہ جو تانبے سے بنائی گئی ہے اور کہیں چینی پنکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔

۲ رمئی ۱۹۷۴ء

دو دن گزر گئے لیکن کچھ لکھنے کی فرصت نہ ملی، نہ ہمت میسر آئی۔ آج گرینوبل سے واپسی پر ریل گاڑی میں بیٹھ کر چند یادیں محفوظ کر رہا ہوں ریل گاڑی میں میرے سامنے میری رہنما مس ریشیماں بیٹھی ہے اور میرے داہنے ہاتھ پر ایک معمر خاتون اور اس کے سامنے غالباً اس کی عمر بیس سال اور حاملہ لڑکی، یہ دونوں خواتین بہت خوش مزاج واقع ہوئی ہیں۔ بات بات پر ہنستی ہیں اور بیٹی ایسی خندہ دہن ہے کہ ماں اس کی ہر بات کو لطیفہ سمجھ کر کھلکھلا دیتی ہے۔ ماں کے چہرے سے ایک خاص قسم کی دُرشتی جھلکتی

ہے جو عورتوں کو بہت بدصورت بنا دیتی ہے، کبھی میں وہ نرمی نظر آتی ہے جو نسوانی حسن کی رونق بڑھا دیتی ہے۔ لیجئے ماں نے کتاب پڑھنی شروع کر دی اور بیٹی ایک بہت بڑا رنگین اخبار کھول کر بیٹھی ہے۔ مس ریشماں نے بھی کتاب نکال لی ہے۔ گاڑی سے باہر فرانس کے جنوبی حصے کے مناظر نظر آتے ہیں جو اس گاڑی کے مخالف رُخ کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ زیر و بم سی مترنم وادیاں جن پر سبزہ بچھا ہے اور کہیں کہیں پھولوں کا سیلاب ہے جو دھوپ سے دمک رہا ہے، نیلگوں آسمان پر جب پرسنڈ کا دھوکا ہوتا ہے سیاہ بادلوں کے ٹکڑے آویزاں ہیں اور ان بادلوں کے پردے میں سورج نے آگ جلائی ہوئی ہے۔

فرانس کا فن تعمیر ہمارے لیے نہایت اجنبی اور منفرد ہے۔ بعض شہروں میں ایک ہی رنگ کی کئی عمارتیں نظر آتی ہیں اور عمارت چاہے کتنی ہی پرانی اور بوسیدہ کیوں نہ ہو جائے اسے گراتے نہیں، کسی نہ کسی طرح اسے قائم رکھتے ہیں۔ ابھی ابھی گرنیبل میں ستاندال کے دادے کا مکان دیکھا، جوں کا توں کھڑا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ ابھی دیواریں سر پر آ گریں گی اور چھتیں دھڑام دھڑام ڈھے کر مکان کے رہنے والوں کو زندہ دفن کر دیں گی۔ لیکن ابھی تک اس مکان کو گرانے اور اس کی جگہ بہتر مکان بنانے کا خیال کسی کو نہیں آیا۔

۳ مئی ۱۹۷۴ء

چند سطریں گاڑی میں لکھی گئیں۔ رات جب پیرس واپس پہنچے تو میں نے ایک ڈرگ سٹور میں کھانا کھایا۔ میں MENU سے سمجھا کچھ تھا مگر سامنے کچھ اور آ گیا۔ زبان نہ سمجھنے سے بہت کوفت ہوتی ہے۔ بہرحال میں نیم فرانسیسی اور نیم انگریزی لڑھکا دیتا ہوں اور اکثر اس آدھے تیتر اور آدھے بٹیر سے کام چل جاتا ہے۔ ہوٹل میں واپس آتے ہی سو گیا اور رات ایک دلچسپ خواب آیا۔

جگہ: کوچہ چابک سواراں لاہور (ملک کرم الٰہی مرحوم کے مکان کے سامنے)

واقعہ: پنجاب یونیورسٹی کے بہت سے لڑکے ہنگامہ کر رہے ہیں۔ کچھ چھتوں پر چڑھے ہوئے ہیں اور کچھ گلی میں کھڑے ہیں اور تشدد آمیز انداز میں چلا رہے ہیں کہ وائس چانسلر کو بلاؤ۔ میں اپنے گھر سے نکلتے ہوئے ڈرتا ہوں لیکن پھر ہمت کر کے ہر چہ بادا باد کہہ کر دل کو دلاسا دیتا ہوں اور وہاں پہنچ جاتا ہوں جہاں لڑکے جمع ہیں۔ ان سے غصے میں بات چیت کرتا ہوں۔ میں شروع میں ڈرتا ہوں کہ اوپر چھتوں سے اینٹیں نہ برسائیں لیکن لڑکے خلاف توقع خاموش ہو جاتے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ لڑکوں پر میری باتوں کا کچھ تو اثر ہوا۔ یکایک وہ لڑکے غائب ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ میرے پرانے طالب علم میرے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ دو مجھے یاد ہیں، باقی اور تحسین۔ میں خاص قسم کی خود اعتمادی محسوس کر رہا ہوں۔

وقت: غالباً سہ پہر کا ہے، وقت ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ کم از کم میرے لیے —— وقت کیا ہے؟ ابھی میں گاڑی میں تھا اور اب میں یہاں پیرس میں بیٹھا روزنامچہ لکھ رہا ہوں۔ یہ لکھنا بھی وقت ہی میں ممکن ہے، گاڑی میں بیٹھنے والا، روزنامچہ لکھنے والا اور اس سے پہلے کئی سال بچہ پھر جوان، پھر شوہر اور پھر والد، معلم، پرنسپل، وائس چانسلر وغیرہ وغیرہ، یہ سب ایک میں ہوں۔ کیا یہ میں وقت کے ساتھ نہیں بدلتا؟ لیکن "یہ میں" بھی مر جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں بھی مر جاؤں گا، لیکن میں اپنی موت کا تصور نہیں کر سکتا۔ اپنی موت استنباط ہے، ادراک نہیں۔ کیا "میں" کبھی عدم میں بھی داخل ہو گا لیکن "میں" کا شعور بقا کا شعور ہے۔ کروڑوں انسان اس دنیا میں آئے اور بقا کا دھوکا کھا کے زمین کو آباد کر گئے۔ ثقافتیں اور تہذیبیں بنا گئے۔ آج ہم ان کے قصے کہانیاں کہتے ہیں، سنتے ہیں اور وقت کے احساس کو وقت کی تاریخ پڑھ کے زیادہ خوش گوار بناتے ہیں۔

اکثر لوگ جب خواب بیان کرتے ہیں تو خواب کے واقعات کو تو بیان کرتے ہیں لیکن خواب میں وقت کو بیان نہیں کرتے۔ خواب کے واقعے کی تاریخ نہیں پوچھتے کہ یہ واقعہ کس دن، کس سن میں ہوا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ داخلی نقطۂ نظر سے، خواب کا ہر جزو، خواب دیکھنے والے کی شخصیت کا ایک پہلو ہے تو خواب کا وقت بھی اس شخصیت کا ایک پہلو ہونا چاہئے۔ خواب میں مکان دیکھوں تو مکان میری شخصیت کا ایک اظہار ہے اور خواب کا پیغام اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب میں مکان سے مکالمہ قائم کروں۔ اس طرح میں خواب کے وقت سے بھی مکالمہ کر سکتا ہوں تاکہ اس کا پیغام مجھ تک —— میری "انا" تک پہنچ جائے۔

فریڈرک پرلز نے اس اصول کی جو ایک مثال دی ہے وہ مجھے بہت پسند آئی ہے۔ اس کے ایک "مریض" نے خواب میں دیکھا کہ وہ نیویارک کی سنٹرل پارک میں ٹہل رہا ہے۔ پرلز نے کہا کہ تم سنٹرل پارک ہو، اب اپنے آپ سے مکالمہ کرو، چنانچہ اس نے سنٹرل پارک بن کر کہا کہ "میں لوگوں کے پاؤں تلے روندا جاتا ہوں اور لوگ مجھ پر تھوکتے تھے۔"

خواب کے اجزاء کو اگر شخصیتیں سمجھا جائے اور ان میں مکالمے کروائے جائیں تو وہ خوابیدہ قوتیں جو ہر انسان میں مضمر ہیں "آگہی" میں سما جانے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ خواب کا ہر جزو ایک "شخصیت" ہے ہنگامی اور بدلتی ہوئی "شخصیت" جس کے ساتھ مکالمے اور رابطے سے انسان کی پوری "شخصیت" میں حرکت اور "تغیر" کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

۴ مئی ۱۹۷۴ء

رات کے ساڑھے دس بجنے والے ہیں۔ ابھی ابھی موسیو ورنان کے ساتھ کھانا کھا کر آیا ہوں۔ کھانے پر جارج فشر اور اس کی بیوی تاریخ اسلام کا ایک ماہر، ایک نوجوان جو فرانس کے دفتر خارجہ کا ملازم ہے، موجود تھے۔ کھانے پر بہت دلچسپ باتیں ہوئیں۔ فرانس اور پاکستان کی جو باہمی کمیٹی ہے اس کے لیے موسیو ورنان نے یہ موضوع تجویز کیا۔ "روایت اور جدید تہذیب کے تقاضے"۔ اس موضوع پر سب نے اتفاق کیا۔ پاکستان کے علماء (بعض عالم کی جمع) فرانس کی تہذیب و ثقافت پر ایک سوالنامہ مرتب کریں گے اور ان سوالوں کے جواب میں فرانس کے عالم مقالے لکھیں گے اور اسی طرح فرانس کے علماء پاکستان کی تہذیب و ثقافت پر سوال تیار کریں گے اور ان سوالوں کی تحریک سے پاکستان کے عالم مقالے رقم کریں گے۔ پھر ایک کانفرنس جو پہلے پیرس میں ہوگی اور بعد میں پاکستان کے کسی شہر میں وہ مقالے پڑھے جائیں گے۔ ان پر بحث و تمحیص ہوگی اور بحث و تمحیص کے بعد وہ مقالے ایک جامع خلاصے کے ساتھ فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں شائع کیے جائیں گے اور پھر اس کتاب کا اردو ترجمہ ہوگا۔

اس سیمینار کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس میں ایک ہی موضوع پر مختلف زاویہ ہائے نظر سے اظہار خیال کیا جائے گا۔ معاشیات کے ماہر اسے معاشی نقطۂ نظر سے دیکھیں گے اور نفسیات کے ماہر اسے نفسیاتی نقطۂ نظر سے پیش کریں گے۔ جدید علم کا رجحان ایک طرف تو یہ ہے کہ علم کی بہت سی شاخیں ہو گئی ہیں اور ہر شاخ کا ہر پتہ ایک علیحدہ اور مکمل مضمون بن گیا ہے۔ دوسری طرف کوئی مضمون علیحدہ نہیں رہا۔ اب ہر مسئلے کو سمجھنے کے لیے بین المضامینی نقطۂ نظر کے نشو و نما کی ضرورت ہے ورنہ ہر مطالعہ ناقص اور ادھورا رہ جاتا ہے۔ روایت بھی ایک جامع تصور ہے لیکن آپ اسے معاشی، تاریخی، ثقافتی اور نفسیاتی نقطہ ہائے نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ ہر نقطۂ نظر دوسرے نقطۂ نظر کی تکمیل کرتا ہے کیونکہ ہر نقطۂ نظر کچھ "خلا" چھوڑ دیتا ہے اور اس کی اپنی بلوغت کے لیے یہ لازمی ہے کہ خلا کو کوئی اور نقطۂ نظر پُر کرے۔ انسان کو معاشی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو وہ مختلف طبقوں میں بٹ جاتا ہے، حیاتیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو وہ بندر کی ترقی یافتہ صورت ہے اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو وہ جبلی محرکات اور روحانی تقاضوں کی ایک آماجگاہ ہے جس کی زندگی یہی کشمکش اور تصادم ہے اور وہ بہتر انسانیت کی طرف بڑھتا ہے۔

موضوع بھی دلچسپ ہے اور سیمینار کا مجوزہ انداز بھی بہت نادر ہے۔ دیکھیں سیمینار کیسے رہتا ہے، مجھے تو امید ہے کہ سیمینار اچھا رہے گا۔

موسیو ورنان کی دعوت ختم ہوئی AUREVOIR کے کورس (CHORUS) میں دوستوں سے رخصت ہوا، اور موسیو ورنان، ان کی بیوی اور بھائی مجھے ہوٹل تک چھوڑنے آئے۔ میں سونے سے پہلے اس سیمینار کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا رہا، تجزیاتی غور کم تھا اور خواب زیادہ ——— بہرحال میں جلدی سو گیا ——— اتوار کی صبح کو موسیو بوسکے سے ملنا تھا لیکن پروگرام میں الجھاؤ کی وجہ سے مل نہیں سکا۔ اس کی بجائے غیور الاسلام کے ساتھ پیرس کے میلے میں پہنچ گیا۔ اتنی زیادہ چیزیں دیکھ کر میری نظریں تھک جاتی ہیں، الجھن ہوتی ہے کہ جلدی یہاں سے نکل جاؤں یہی حال میرا نیویارک میں ہوتا تھا۔ تاہم سکوئر سے ہمیشہ بھاگنے کو جی چاہتا تھا مجھے اشیاء کے اژدحام میں اپنی کم قدری کا احساس ہوتا ہے اور اس کثرت سے وحشت ہوتی ہے جو وحدت کے رشتے میں پروئی نہیں جا سکتی ہیں۔ مورخوں کے عام انداز تحریر کی وجہ سے بعض تاریخ میں کبھی دلچسپی نہیں پیدا کر سکا۔ جب تک تاریخی واقعات کی کڑیاں سلسلہ نہ بنائیں، میں ان میں دلچسپی نہیں لے سکتا۔ اسی لیے تاریخ سے .... زیادہ فلسفۂ تاریخ سے شغف ہے۔ سوانح عمریاں اچھی لگتی ہیں، خود نوشت سوانح عمریاں پسند

نہیں آتیں۔ پلوٹارک کی کردار نگاری کس قدر حسین اور سحر آفریں ہے۔ گبن کا شاہکار، روم کا زوال اس لیے ایک نادر کتاب ہے کہ اس کے ہاں تاریخ ایک تمثیل بن جاتی ہے جس میں وہ ہر شخصیت کا پہلو وار تجزیہ کرتا ہے۔ گبن محض مؤرخ نہیں مفکر بھی ہے اور تقریباً ہر پیرے میں کوئی نہ کوئی فلسفیانہ بصیرت بیان کرتا ہے جس سے عقل میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ابن خلدون کارل مارکس، ٹائن بی اور ٹریوولین کو پڑھ کر خبر و نظر دونوں مضطرب ہوتی ہے اور دونوں تسکین پاتی ہیں۔ میلے سے میں جلدی بھاگ نکلا۔ رات کو BOULVARD ST. GERMAIN کی سیر کی اور ایک کیفے میں جا کر کھانا کھایا۔ رات کے دو بجے تک پڑھتا رہا اور تحقیق و تجسس کے نئے منصوبے بنا کر سو گیا۔

۶ رمئی ۱۹۷۴ء

پیر کی صبح کو ایڈتھ آئی اور مجھے فرانس کی وزارت خارجہ کے ایک نمائندے کے پاس لے گئی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ باتوں باتوں میں میں نے یہ بھی کہا کہ موسیو مو کے یورپ میں جنون کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم ایشیا میں جنون کی تاریخ لکھنے میں ان کا تعاون کریں یا وہ ہمارا تعاون کریں۔ یہ بات فرانسیسی نمائندے کو بہت پسند آئی اور میں نے سوچا کہ یہ ایک انقلابی منصوبہ رہے گا۔

دو بجے ہم مہاتما گاندھی روڈ پر روائتی اور لوک کلچر کے عجائب گھر میں گئے فرانس کے ہر خطے پر شہر سے وہاں کی تاریخی اور روایتی اشیا جمع کی گئی ہیں اور انہیں تاریخی اعتبار سے نہیں بلکہ مماثلت کے لحاظ سے یکجا کیا گیا ہے۔ کھیتوں میں ہل چلاتے، بار برداری، مویشی پروری وغیرہ کے متعلق بہت سے اوزار جمع کئے گئے ہیں، انہیں باہمی مشابہت کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے۔ اس کلچر میں سب کچھ آجاتا ہے، خطاطی، موسیقی، مصوری، طب وغیرہ وغیرہ۔

غرضیکہ وہ ہر چیز جو کسی کلچر کی ساخت کا جزو ہے اس میں شامل کر دی جاتی ہے۔ یہ عجائب گھر دیکھ کر مجھے اپنے ہاں فن خطاطی کے انحطاط کا شدید احساس ہوا۔ اگر یہ فن محض عجائب گھروں کی زینت ہی بنا رہا تو اس کے بہترین نمونے یکجا کر لینے چاہئیں یا یہ کہ اس کی باقاعدہ تربیت نیشنل کالج آف آرٹس میں ہونی چاہئے ورنہ یہ فن ماضی کے گمنام دفینوں میں کھو جائے گا۔ ہم یہ عجائب گھر محض اس لیے نہیں دیکھتے کہ ماضی کے عجائب و غرائب کو

دیکھیں اور محض تماشائی کی طرح اس زمانہ کے فنون کی داد دیں بلکہ اس لیے دیکھتے ہیں اور یہی بنیادی بات ہے کہ ان فنون کے ساتھ اپنا ثقافتی تعلق پیدا کریں۔ یہ تعلق ڈھل کر ہمارے ہنگامی شعور میں کوئی صورت اختیار کرے۔

ہر ثقافت کی ایک ساخت ہوتی ہے لیکن یہ ساخت کسی قطعی خود اختیاری کی حامل نہیں ہوتی بلکہ اس کے رابطے دوسری ثقافتوں کے عروج و زوال سے قائم ہوتے ہیں اور اس ساخت کا ایک تاریخی پس منظر بھی ہوتا ہے۔ اجتماعی اور معاشی اور سیاسی حالات اس کے قیام کے بہت حد تک ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ عجائب گھر اور اس کے متنوع اجزاء کو دیکھ کر ایک نئی دنیا میں داخل ہونے کا احساس ہوا۔ گویا یہ چھوٹی چھوٹی گھریلو چیزیں جنہیں ہم فقط استعمال کرتے ہیں اور جن کا ادراک ایک چیز کا ادراک ہوتا ہے کس طرح ایک کلچر کے وسیع سانچے میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ جمالیاتی تسکین کچھ اور اصولوں سے بھی پیدا ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں ضرورت ہے قومی تشخص کی شناخت کی۔ جہاں تک تشخص کا تعلق ہے اس کی تہہ میں نو آبادیاتی کم قدری ذات کا احساس ہے۔ اگر ہم کبھی اپنے تحت اللسان الفاظ کو سنیں جسے صوفیائے کرام نے حدیث النفس کہا ہے تو ہم پر یہ کھلے گا کہ ہم اکثر و بیشتر اپنے آپ کو کم قدر سمجھتے ہیں اور اپنے آپ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جن میں تحقیرِ ذات کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ غیر متنعین تشتخص کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ سے یہ کہہ سکے:

۱۔ میں زندہ ہوں۔

۲۔ میں ایک انسان ہوں۔

(۳) بحیثیت ایک انسان کے میری ایک بنیادی قدر ہے — یا بحیثیت ایک انسان کے مجھ میں ایک کبریائی شرر ہے۔

یہ بنیادی قدر زندگی کی طرح گھٹتی بڑھتی نہیں۔ یہ نہیں کہ اگر میں کوئی اچھا کام کروں تو میری قدر بڑھ جائے گی اور اگر برا کام کروں تو کم ہو جائے گی یا یہ کہ اگر میں ذہین ہوں تو میری قدر زیادہ ہے۔ اور اگر کند ذہن ہوں تو قدر کم ہے۔ یہ سب خارجی قدریں ہیں۔ میرا انسان ہونا ہی ایک بنیادی قدر ہے۔ مجھ میں ہر وقت بدلنے کی اپنی شخصیت کو نئے تجربوں سے آشنا کرنے کی اور ان تجربوں کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کی صلاحیت موجود ہے۔۔ ایک عورت ایک ماہر تجزیۂ نفس کے پاس اپنے شوہر کی برائیاں کرتی رہی جب دل کا غبار اچھی طرح نکال لیا تو

ایک وقفے کے بعد کہنے لگی۔ "وہ اچھا بننے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔" یہ ایمان کہ ہر شخص اچھا، بہتر بننے کی کوشش ضرور کر سکتا ہے، اس بنیادی قدر پر ایمان ہے۔

۴۔ مجھے اپنا آپ بننے کے لیے کسی کی محبت یا مقبولیت نہیں چاہیئے۔ ایک بالغ انسان کی حیثیت سے میرا کام احترامِ ذات یا عزتِ نفس پیدا کرنا ہے اور دوسروں سے محبت کرنا ہے۔ محبت مانگنی نہیں دوسروں کی محبت کی احتیاج نہیں پیدا کرتا، بلکہ دوسروں کو محبت دینا ہے کسی کی محبت میسّر آجائے تو مسرّت کا باعث ہے لیکن اگر نہ آئے تو اس سے کوئی قیامت نہیں آجاتی۔ محبت کی طلب اور احتیاج سے پریشانی، اپنی ذات کی کم قدری، ذہنی بیماریاں اور جذباتی اُلجھاؤ پیدا ہوتے ہیں۔

رشک کی کیفیت، حسد کی کیفیت سے مختلف ہے، رشک کسی دوسرے شخص کی خوشی برداشت نہ کرنے کا نام ہے لیکن حسد تین اشخاص کے رشتے کا نام ہے۔ اگر دو اشخاص ایک ہی محبوب کو چاہتے ہیں یا ایک چیز کو پسند کرتے ہیں تو ان کا باہمی رشتہ حسد ہوتا ہے۔ رشک کی کیفیت یہ ہے کہ کسی دوسرے انسان کو خوش رُو، دولت مند، ہنستے کھیلتے، زندگی کی لذتوں سے متمتع ہوتے دیکھ کر جل جاتا ہے اور دل میں یہ خواہش کرتا ہے کہ کسی طرح اس کی خوشی اس کی کامیابی کو چھین لیا جائے لیکن جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے اپنے اندر بھی خوش ہونے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے لیکن وہ اسے اجتماعی ضمیر کے بوجھ تلے دبا دیتا ہے۔ اگر وہ اس دباؤ کا شعور حاصل کر لے اور جن جن گران اثرات کا تجزیہ کرے جنھوں نے اسے خوشی اور مسرت سے باز رکھا ہے تو اس کے دل میں بھی خوشی کے چشمے پھوٹیں گے اور دوسروں کا رشک جاتا رہے گا۔ جب بھی میں کسی شخص پر اخلاقی حکم لگاتا ہوں، اس کی کسی حرکت پر اسے بُرا بھلا کہتا ہوں تو داخلی طور پر میں اپنی آرزوؤں پر تنقید کر رہا ہوتا ہوں، جو دوسروں کو جا بجا بُرا بھلا کہتا رہتا ہے وہ اپنے آپ کو بھی کوستا رہتا ہے۔ دوسرے لوگوں کی خوشی کو میں جبھی برداشت کر سکتا ہوں جب میں اپنی خوشی کی صلاحیت کو قبول کر لوں۔

اس طرح حسد میں یہ خیال عاشق کے لیے سوہانِ روح بن جاتا ہے کہ اس کا محبوب کسی اور عاشق کی صحبت میں بیٹھے۔ ذہن میں طرح طرح کے تصورات آتے ہیں کہ رقیب اور محبوب رنگ رلیاں منا رہے ہیں، لیکن ان تصورات کی تہ میں اپنی کم قدری کا احساس ہوتا ہے۔ اگر محبوب آپ کو پسند نہیں کرتا تو یہ اس کا مسئلہ ہے۔ کسی محبوب کو کھو دینا اپنے آپ کو کھو دینے سے کہیں بہتر ہے۔ اگر انسان اپنی اساسی قدر پہچان لے اور یہ سمجھ لے کہ محبوب کی محبت نہ ملنے سے قیامت نہیں آجاتی، حشر نہیں برپا ہو جاتا، تباہی نہیں آجاتی بلکہ یہ محض ایک حادثہ ہے جس سے میری اساسی قدر میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آئے گا تو اس خیال کو بار بار ذہن میں لانے سے حسد کا جذبہ اپنی شدت سے محروم ہو جائے گا، محبوب کی جدائی غم انگیز تو ہے مگر کوئی بربادی نہیں کہ انسان اس کے احساس سے ہر وقت پریشان رہے۔

ارادی طور پر ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ میں ایک مختلف شخصیت ہوں۔ میرا ایک علیحدہ تشخص ہے۔ محبوب کی شخصیت ایک الگ شخصیت ہے۔ اس کے تقاضے اور ہیں اور میرے تقاضے اور۔ اس سوچ کی تکرار سے وہ لاشعوری بندھن ٹوٹ جاتا ہے جس کی وجہ سے محبوب سے جدائی الم ناک ہو جاتی ہے پر IDENTIFICATION کو دانتوں سے چبا دینا چاہیئے۔ یہ کام ہے تو مشکل لیکن اسے نہ کرنا مشکل تر ہے۔

وہ باتیں جو ذہن میں خلل پیدا کرتی ہیں اور اکثر و بیشتر لوگوں کو پریشان رکھتی ہیں، ان میں ایک مفروضہ یہ بھی ہے کہ جو باتیں ہو چکی ہیں ان پر ندامت کا احساس پیدا ہو اور یہی چاہے کہ کاش ایسا نہ ہوتا! لیکن "یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟" کی تکرار سے الم کا احساس بڑھتا ہے اور انسان تخیّل کی دُنیا میں ماضی کے گزرے ہوئے واقعات کو اُلٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ یہ ایک غیر معقول مفروضہ ہے گویا آپ بیتے ہوئے واقعات کو بدل رہے ہیں۔ اس مفروضے میں ایک قباحت یہ بھی ہے کہ آپ اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ میں وقت کو تبدیل کر سکتا ہوں۔ صحیح مفروضہ یہ ہے کہ آپ سے جو کچھ بھی ہوا ہے وہ اٹل ہے اور اس کے آپ ذمہ دار ہیں۔ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا" کا احساس انسانی ذمہ داری کے احساس کو کم کرتا ہے اور مشیتِ ایزدی کے خلاف جارحانہ بغاوت کی علامت ہے۔

اسی کے ساتھ ایک اور مفروضہ وابستہ ہے۔ یہ غیر معقول مفروضہ کہ محض فکر و تشویش سے حالات بدل جائیں گے، لیکن فکر کرنے سے حالات نہیں بدلتے۔ اس مفروضے کی ضد کی تکرار کرنا چاہیے کہ فکر کرنے سے حالات نہیں بدلیں گے بلکہ تشویش کی حالت میں انسان میں وہ قابلیت نہیں رہتی کہ وہ حالات کا پوری طرح محاسبہ کر سکے۔ حالات عقل و عشق کی راہنمائی ہی میں بدل سکتے ہیں۔

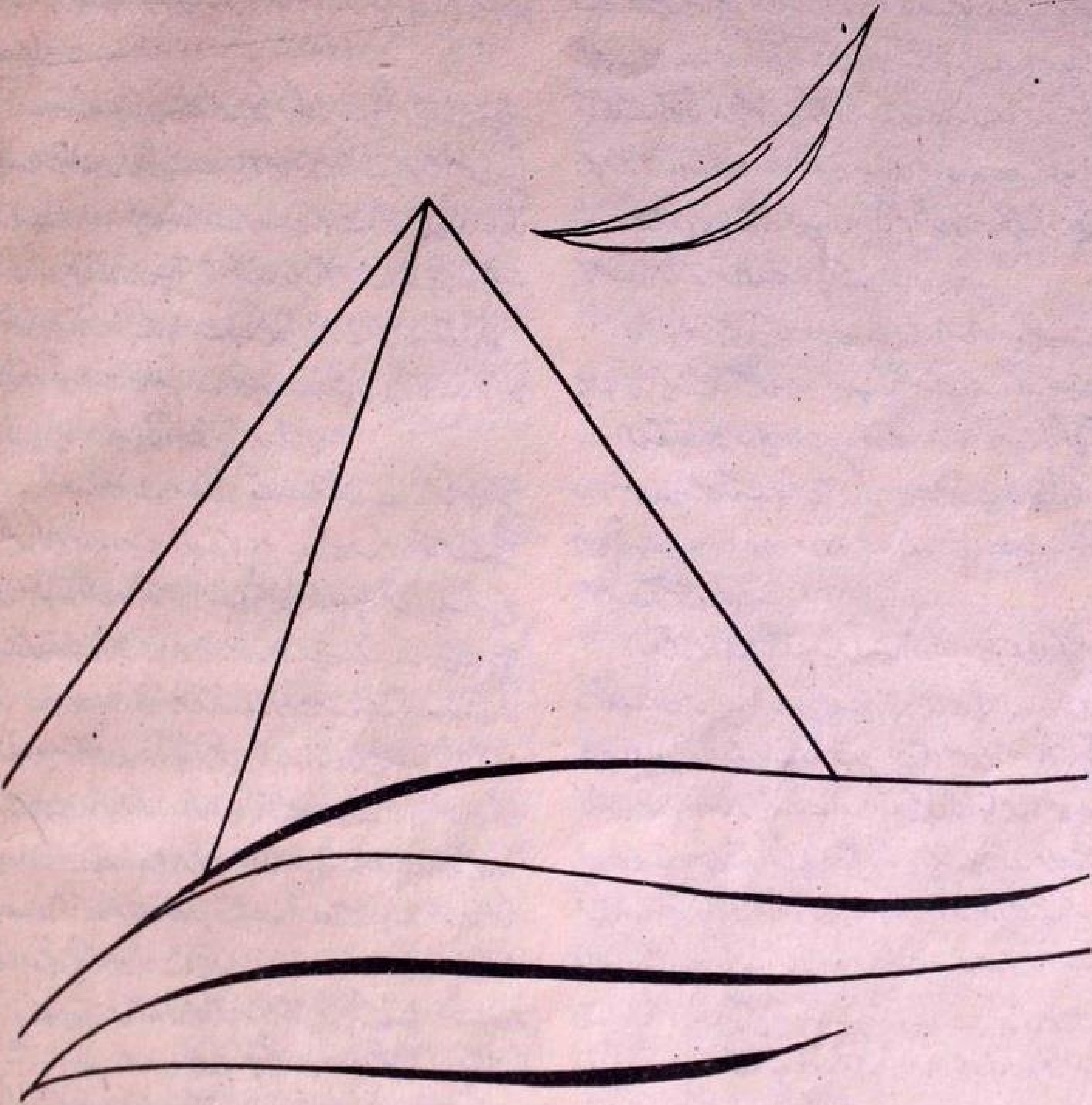

دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار

قرۃ العین حیدر

ہرے رنگ کی طویل لکڑی کوچ چیک پوسٹ کی بے رونق عمارت کے نیچے منتظر کھڑی تھی۔ سمندری ہوا میں کھجور کے پتے ہلتے تو ان میں سے چھنتی ہوئی سورج کی کرنوں میں اس کی شفاف سطح جھلملا اٹھتی ایک بارک میں سے نکل کر چند وردی پوش کھٹ کھٹ کر کے سڑک پر آگئے اور اچک کر ایک ٹرک میں بیٹھ گئے۔ جیٹی کی سمت سے آتے ہوئے گروہ کو دیکھ کر کوچ کا ایکٹر نما ڈرائیور رنگین رومال سے اپنی باریک مونچھیں صاف کرتا ہوا چاء خانے سے لوٹا اور بڑے اہتمام سے سگریٹ سلگانے میں مصروف ہوگیا۔ سڑک کی دوسری طرف ایک اجاڑ سے رہائشی بلاک کی ایک بالکنی میں دروازہ کھلا اور سیاہ فراک میں ملبوس ایک موٹی عورت نے باہر جھانکا اور اخبار کا بڑا سا پڑا بنا کر نیچے پھینک دیا جو ہوا میں آہستہ آہستہ تیرتا ہوا آکر فٹ پاتھ پر گر گیا۔

جیٹی کی سیڑھیوں پر سے یہ سارا منظر "سلو موشن" کی خاموش فلم معلوم ہو رہا تھا۔

الوریا لانچ پر سے کود کر نچلی سیڑھی پر آگئی۔ شارمین آگے آگے چلتے ہوئے کسی بات پر بچوں کی طرح ہنسی۔ اور روِن دھتی اپنی بچی اوروتی کی انگلی پکڑ کر اوپر چڑھنے لگی۔

لمبے ایجنٹ نے بڑے وقار سے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے بڑھ کر کوچ کا دروازہ کھولا اور جب وہ سب اندر داخل ہونے لگے تو بار بار سر خم کر کے مسکرایا کیا۔

وہ امریکن وضع کے سوٹ میں ملبوس تھا اور آنکھوں پر اس نے بہت پھیلے ہوئے گوگلز لگا رکھے تھے۔ اس کا مونچھوں والا ادھیڑ عمر کا اسسٹنٹ جس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور جو اپنی چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کی وجہ سے بہت زندہ دل اور خوش مزاج معلوم ہوتا تھا سب سے آخر میں تقریباً پھدکتے ہوئے آکر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

الوریا اور شارمین اس سے پچھلی سیٹ پر ٹک گئی تھیں اور روِن دھتی اور اوروتی ان کے برابر دوسری طرف بیٹھ گئیں۔ ڈاکٹر رائے چودھری سب سے پیچھے جا کر اخبار میں مشغول ہو چکے تھے۔ ٹھاکر موہن سنگھ الوریا کے پیچھے براجمان تھے۔ جب کوچ روانہ ہوئی تو انہوں نے آگے جھک کر کہنا شروع کیا: "جب میں ۱۹۵۱ء میں یہاں آیا تھا۔"

ٹھاکر موہن سنگھ بات بات پر سب کو یاد دلاتے رہتے تھے کہ یہ ان کا دوسرا سفر ہے۔ ایک عاقل اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے سیاح کی حیثیت سے وہ بڑے سرپرستانہ انداز میں اناڑی مسافروں کو اپنے پچھلے بحری سفر کے واقعات سناتے اور مشوروں سے مستفید کرتے۔

الوریا نے اوروِن دھتی کا بیگ جو سیٹ کے نیچے رکھا تھا ہاتھ بڑھا کر اوپر کھینچا۔ اس میں اوروتی کے دو کومک اور ونسٹن چرچل کی وہ ضخیم تصنیف جو ڈاکٹر رائے چودھری کل سے پڑھ رہے تھے نیٹنگ کی اون کے ساتھ ٹھنسی ہوئی تھی۔ مایوس ہو کر الوریا نے چاروں طرف دیکھا۔ مونچھوں والا اسسٹنٹ صبح کے الاہرام کا بونگا بنائے ڈرائیور کے شانے کو اس سے کھٹ کھٹ رہا تھا اور لمبے ایجنٹ سے کچھ کہتا جاتا تھا۔ اس نے ایک انگلی میں سونے کی موٹی سی انگوٹھی پہن رکھی تھی جس میں سیاہ پتھر جڑا تھا۔

الوریا نے پیچھے دیکھا۔ مسٹر سنگھ کے برابر بیٹھی ہوئی مسز کمک ڈانلڈ ایک زنانہ امریکن رسالہ گود میں بچھا کر آرام سے سگریٹ جلا رہی تھیں۔ رسالے کے سنٹر اسپریڈ پر ایک سمت رومینٹک والا ہیرو ایک پوڈل کٹ بالوں والی ہیروئن کی آنکھوں میں بڑی لجاجت سے جھانک رہا تھا۔ الوریا پیچھے مڑ کر بیٹھ گئی۔ اور سیٹ کی پشت پر بازو رکھ کر مسز ہارڈنگ کے فراک پر چھپے ہوئے مور گننے لگی۔ ایک۔ دو۔ تین چار۔ یقیناً انہوں نے یہ کپڑا الکھادی گام او ووگ سے خریدا ہے۔

پانچ۔ چھ۔ سات: "کیا گن رہی ہو؟" مسز کمک ڈانلڈ نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" الوریا نے بڑے عجز سے مسکرا کر جواب دیا پھر اس نے اچک کر مسز کمک ڈانلڈ کی گود میں بچھے ہوئے زنانہ چمکیلے باتصویر امریکن رسالے کی کہانی کو الٹی طرف سے پڑھنا شروع کیا جب میں ایک نوجوان روکا تھا تو میری ماں نے مجھ سے کہا تھا ڈکی بوائے۔ تم ساری عمر

پرچھائیوں کی تلاش کروگے۔ جب میں یونیورسٹی میں پہنچا تو شرلی نے مجھ سے کہا تھا۔ ڈک ڈہنی، تم چاند کے تمنائی ہو۔ مجھ سے شرلی نے کہا تھا تم بھنگے ہو اور ستاروں کے خواب دیکھتے ہو۔ لیکن میں سوچا کیا۔ شاید۔ اس کے بعد ۔ اور آگے بڑھ کر کہیں۔ کسی نکڑ پر۔ کسی شہر میں پہنچ کر۔ کسی دروازے سے برآمد ہو کر وہ مل جائے۔ اس وقت تک اپنی آنکھیں انتظار میں بند رکھو۔" اور زیادہ اکتاہٹ کے ساتھ الویرا پھر سیٹ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کوچ میں باتوں کی بھنبھناہٹ جاری تھی۔ چاروں انگریز مشنری خواتین۔ پاکستانی انجینئر، لاہور کی لیڈی ڈاکٹر جو نئی دلہن تھی اور بہت بھڑکیلا شلوار قمیص کا سوٹ پہنے تھی اس کا منحنی سا شوہر جو چارٹرڈ اکاؤنٹنسی پڑھنے جا رہا ہوں جی۔ ایک روز جب الویرا نے اس سے جرح کی تھی کہ آپ انگلینڈ کیوں جا رہے ہیں تو اس نے بے حد نیازمندی سے مبہم سے لہجے میں جواب دیا تھا۔ دو نوعمر لڑکے دلہن دس سال لندن رہنے کے ارادے سے مصروف سفر تھے، موٹا خوبصورت انگریز اور اس کی لمبے لمبے دانتوں والی سیاہ فام مدارسی بیوی، کوچ کے آخری سرے تک سارے مانوس سر کھڑکیوں سے ٹکے باہر دیکھ رہے تھے۔ بمبئی سے آئی ہوئی نرگس کی ہم شکل بوہرہ لڑکی نے جو ہمیشہ بے حد اسمارٹ فراک یا جینز پہنتی تھی نیچے سروں میں۔

HANG DOWN YOUR HEAD TOM DOOLEY

گانا شروع کر دیا تھا۔

کوچ اب سویز کے شہر سے نکل ریگستان میں داخل ہو چکی تھی افق کے کنارے کنارے دو پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں جن میں سے ایک کی شکل ایک مہیب ممی کی ایسی تھی جس کا پر دفائیل آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور جس کے سیاہ پاؤں جنوب کی سمت پھیلے تھے۔ دفعتاً لیے ایجنٹ کی آواز نے الویرا کو چونکا دیا۔

"آپ لوگ جب دس سال بعد یہاں آئیں گے اس وقت تک انشاء اللہ ہمارا اسوان ڈیم تیار ہو چکا ہو گا اور قاہرہ تک یہ اسی میل کا صحرا دنیا کے زرخیز ترین علاقوں میں شامل ہو جائے گا۔"

"انشاء اللہ۔" الویرا نے بے ساختہ دہرایا۔

"ہمارے ایک بادشاہ نے جو ہمارے اور سب بادشاہوں سے زیادہ بیہودہ تھا، پچھلی صدی میں یہ محل بنوایا تھا۔" ایجنٹ نے جو مسافروں کی طرف رخ کیے، ہاتھ میں مائیکروفون لیے بیٹھا تھا، باہر اشارہ کرتے ہوئے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ خشک بے رنگ پہاڑیوں کے دامن میں بنی ہوئی ایک بھدی سی عمارت دھوپ میں بری طرح چمک رہی تھی۔ ہمارے اس نامعقول بادشاہ نے ایک کسان لڑکی کو یہاں بھیڑیں چراتے دیکھا اور فوراً اس پر عاشق ہو گیا۔ اس کے لیے کئی لاکھ پاؤنڈ کی مالیت کا یہ محل بنوایا گیا جب کہ ہمارے فلاحین ریگستان کی بھوک میں مر گئے۔ اور ریتلی زہریلی ہوائیں ان کو اندھا کرتی رہیں۔"

"طٰہٰ حسین۔" الویرا کی زبان سے نکلا۔

مونچھوں والے نے مڑ کر خوشی سے اسے دیکھا۔ "آپ طٰہٰ حسین کو جانتی ہیں مادموزیل؟"

"ان کے مضمون پڑھے ہیں۔" اس نے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔

"پھر وہ حسین چرواہی ملکہ بن کر اس محل میں براجی۔" ایجنٹ کہتا رہا۔

نوری اور جام تماچی - فرح دیبا اور شاہ ایران - مارگریٹ اور ٹونی۔

شہزادی اور فوٹوگرافر کا سنسنی خیز رومان - رائل گورنس کی لکھی ہوئی دوسری قسط اس شمارے میں پڑھیے۔" مسز مک ڈانلڈ نے رسالے کا دوسرا ورق الٹا۔

نرگس کی ہم شکل لڑکی نے پچھلے مہینے کا فلم فیئر لیڈی ڈاکٹر دلہن کے حوالے کیا جو بڑے شدید اشتیاق سے اس کی تصاویر دیکھنے لگی۔ نرگس اور سنیل دت - مدھو بالا اور کشور کمار - دلیپ کمار اور وجینتی مالا۔

اورینٹ کے رومان - آہ افسانوی مشرق - اور پر اسرار ہندوستان۔

"میں اتنی خوش نصیب ہوں کہ میں نے تاج محل عین پورے چاند کے نیچے دیکھا۔" نیویارک کی ادھیڑ مجرد خاتون نے اٹلانٹک سٹی کی ادھیڑ مجرد خاتون سے کہا جو انڈین ٹورسٹ ڈپارٹمنٹ کے شائع کردہ ۱۹۶۱ء میں ہندوستان آئیے" کے رنگین اور چمکدار باتصویر کتابچوں کی ورق گردانی کر رہی تھیں۔

محل اب پہاڑیوں کے پیچھے چھپ چلا تھا۔ یک بیک سب خاموش ہو گئے۔ اخباروں اور رسالوں کے اوراق کھڑکھڑاتے رہے۔ دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

اچانک گہرا نیلا سمندر عین آنکھوں کے سامنے لہریں مارنے لگا۔ شفاف، ٹھنڈا، نیلگوں پانی صحرا کی زرد تپتی ہوئی ریت کے مقابل میں اس کی نیلاہٹ اور زیادہ بھلی اور فرحت بخش معلوم ہوئی۔

ہم لوگ اتنی دور نکل آئے مگر ابھی تک سمندر کے کنارے کنارے چل رہے ہیں۔ شارمین نے اظہارِ خیال کیا۔ لمبے ایجنٹ نے ریڈیو ٹیون کرنا شروع کیا۔

"ام کلثوم کے گانے آ رہے ہیں؟" الویرا نے دریافت کیا۔

"آپ ام کلثوم کو بھی جانتی ہیں؟" مونچھوں والے اسسٹنٹ نے اسی مسرت کے ساتھ پوچھا۔ "کل شام انہوں نے قاہرہ سے گایا تھا۔"

سمندر اب بہت قریب آ گیا۔ پھر دفعتاً غائب ہو گیا۔

"ہم لوگ اب تک ساحل کے قریب ہیں، قاہرہ کتنی دور ہے؟" الویرا نے ایجنٹ سے دریافت کیا۔

"یہ سمندر نہیں تھا۔ سراب تھا۔" ایجنٹ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اوہ۔ سراب!!" شارمین نے کہا۔

سراب۔ سراب۔ سراب۔

قاہرہ کے باہر بلیو پولس کی شاندار عمارتیں سورج کی روشنی میں نہا رہی تھیں۔ کوچ شاہ فاروق کے بکنگھم پیلس کی نقل میں بنوائے محل کے سامنے سے گذری تو لمبے ایجنٹ نے قہقہہ لگایا۔ "یہ ہمارے بے چارے بادشاہوں کے احساسِ کمتری کی بہترین مثال ہے۔" نیل کی لہروں پر پاشاؤں کے شکارے ساکت کھڑے تھے۔ نائیل ہلٹن کی دیواروں پر قدیم مصری فریسکوز کے چربے بنے ہوئے تھے۔

"کاش ہم نئے مشرقی لوگ تجدید کے جوش میں اپنے اجنتاؤں اور اپنے اہراموں کو اس طرح COMMERCIALISE نہ کرتے۔" شارمین نے مسٹر سنگھ سے کہا۔ "اب تاج محل کے ذکر پر محض بمبئی کے تاج ہوٹل کا خیال آتا ہے۔"

"تم آخر چاہتی کیا ہو؟" الویرا نے تیوری پر بل ڈال کر اس سے استفسار کیا۔

"میں ۱۹۵۱ء میں جب یہاں آیا تھا۔" ٹھاکر موہن سنگھ نے موقع غنیمت جان کر کہنا شروع کیا۔

الویرا کو پھر جیوتسنا یاد آ گئی۔ جب وہ دونوں تین دن تک قاہرہ کے بازاروں میں گھومتی پھری تھیں اور کسفرڈ سے نکلی ہوئی دو معصوم اکیڈمک لڑکیاں۔ جن کے سامنے دنیا میں صرف امیدیں ہی امیدیں تھیں۔ دس سال قبل۔ دس سال میں بچے جوان ہو جاتے ہیں۔ جوان ادھیڑ۔ اور ادھیڑ بوڑھے ہو چکے ہیں۔ دس سال۔ دس سال۔ دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار۔

وہ اسکندریہ گئی تھیں۔ یونیورسٹی جا کر شہزادی دینا حمید سے ملی تھیں جو کیمبرج میں ان کے ساتھ رہ چکی تھی۔ جیوتسنا اہرام کے اندر نہیں گئی تھی۔ میرا تو دم گھٹ جائے گا۔ تنگ جگہوں میں مجھے لگتا ہے جیسے مر رہی ہوں۔ میں مرنا بالکل نہیں چاہتی بھئی اس نے کہا تھا۔ آج جیوتسنا کو خودکشی کیے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا۔

شام کو چائے پینے کے لیے وہ سب ایک قہوہ خانے میں گئے۔ صحن میں دور دور تک کرسیاں اور میزیں لوگوں سے گھری ہوئی تھیں۔ تینوں لڑکیاں اور ڈاکٹر رائے چودھری اور ان کی بچی کونے کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور سوڈانی ویٹر کا انتظار کرنے لگے۔

دفعتاً اورن دھتی نے کہا۔ "ادھر دیکھو۔ کیا ہو رہا ہے۔"

الویرا اور شارمین نے فوراً مڑ کر دیکھا۔

صحن کے شمالی سرے پر ایک بے حد حسین اٹھارہ انیس سالہ لڑکی سبز رنگ کے فراک میں ملبوس سبز ہیٹ لگائے بہت سے مردوں کے ہجوم میں گھری بیٹھی تھی۔ لمبا ایجنٹ بھی وہیں پہنچا ہوا تھا اور اس کی کرسی کا طواف کر رہا تھا۔

"کس قدر خوبصورت لڑکی ہے۔" اورن دھتی نے کہا۔

"یہ ماڈل ہے یا ٹیلی ویژن ایکٹرس۔" شارمین نے شرلک ہومز کے انداز میں اطلاع دی۔

"لگتا ہے جیسے ووگ کے صفحوں میں سے نکل کر آ گئی ہے۔" الویرا نے کہا۔

تینوں لڑکیاں حیرت اور دلچسپی سے اسے دیکھتی رہیں۔ وہ بڑی تمکنت کے ساتھ گویا تخت پر بیٹھی تھی اور اس کے عشاق اس کے سامنے درباریوں کی طرح کھڑے تھے لمبے ایجنٹ سمیت کسی ایک نے جھک جھک کر اسے پیار بھی کیا۔

"مڈل ایسٹ میں بیہودگی کی انتہا ہے۔ واقعی۔" شارمین نے کہا۔ ڈاکٹر

رائے چودھری کی موجودگی کی وجہ سے جھینپتے ہوئے اس نے نظریں دوسری طرف کرلیں اور جلدی سے چلتے بنانے لگی۔ سن رسیدہ اور خاموش طبیعت ڈاکٹر رائے چودھری جو اپنی نوجوان بیوی کی سہیلیوں سے بہت کم بات کرتے تھے شفقت سے مسکرائے۔ "میں اس خوشگوار نتیجے پر پہنچا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ "کہ تم ہندوستانی عورتیں کتنی ہی جدید اور آزاد خیال بن جاؤ، اصلیت میں رہو گی وہی ہندوستانی عورت!!"

کافی دیر بعد ایجنٹ ان کی طرف آیا۔ وہ لڑکی بھی اس کے پیچھے پیچھے آگئی۔ اور ایک بڑے درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی جس کا آدھا تنا بار روم میں شامل تھا۔ بار پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے پلٹ کر اسے دیکھا اور مسکرائے جواباً وہ بھی مسکرائی۔ ایک درشت چہرے والی عورت جس نے بے تحاشا نقلی زیور پہنا ہوا تھا تیز تیز قدم رکھتی پاؤڈر روم سے نکلی، ساری میں ملبوس لڑکیوں کو غور سے دیکھا اور کھٹ کھٹ کرتی پہلو کی اندھیری گلی میں اتر گئی۔

باہر چوڑی سڑک بالکل سنسان تھی وہ تینوں کوچ میں جاکر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئیں۔

اس وقت انہوں نے پہلی مرتبہ اس سرخ بالوں والی عورت کو دیکھا۔ وہ سب سے اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی، جہاں مونچھوں والا اسسٹنٹ بیٹھا تھا۔ اس نے کتھئی رنگ کے بہت معمولی کپڑے کا کوٹ اور اسکرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ لڑکیوں کو دیکھ کر ایک دفعہ مسکرائی۔ اس نے پپوٹوں پر گہرا سبز رنگ اور پلکوں پر سیاہ روغن لگایا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں بہت بڑی معلوم ہورہی تھیں۔ اس کے سراپا میں سب سے زیادہ ممتاز چیز اس کے بال تھے۔ آگ کی طرح دہکتے ہوئے سرخ بال۔ اس کی عمر پینتیس سے چالیس سال رہی ہوگی۔ ممکن ہے اس سے کم رہی ہو۔ مگر جس قسم کی زندگی وہ بظاہر گزارتی تھی اس کی وجہ سے وہ زیادہ عمر رسیدہ معلوم ہورہی تھی۔ اور اس کے خاصے حسین چہرے پر عجیب طرح کی سختی آگئی تھی۔ نوجوانی میں یہ عورت بھی سبز فراک والی ماڈل کی مانند بے انتہا دلکش رہی ہوگی۔

اب سبز فراک والی لڑکی بھی اندر آگئی اور لمبے ایجنٹ کے پاس بیٹھ گئی۔ مونچھوں والا اسسٹنٹ سرخ بالوں والی کے پاس آن بیٹھا۔

کوچ روانہ ہوئی۔ سرخ بالوں والی عورت نے تیز تیز لہجے میں مونچھوں والے سے عربی میں کچھ کہنا شروع کیا۔ مونچھوں والا ہنس ہنس کر جواب دیتا رہا۔ پھر اس نے مڑ کر الویرا اور شارمین سے کہا۔ "یہ میری بیوی ہے!" اس پر عورت اور زیادہ خفا ہوئی اور اس نے مزید عربی بولی۔ الویرا اور شارمین جھینپ گئیں۔

ڈاؤن ٹاؤن قاہرہ میں پہنچ کر وہ سب ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور کے سامنے اتر گئے۔ اور دن بھر خریداری کرتی پھریں۔ الویرا اور شارمین پیدل چلتے چلتے نڈھال ہوگئیں۔ سب لوگ تتر بتر ہوچکے تھے۔ کچھ دیر بعد لمبا ایجنٹ باقی لوگوں کی قیادت کرتا ہوا دوسری فٹ پاتھ پر سے آتا نظر آیا۔ ایک ایوینیو پر وہ ان تینوں سے آن ملا۔ سبز فراک والی حسین لڑکی اس کے ہمراہ تھی۔

"یہ کون خاتون ہیں؟" آخر شارمین سے پوچھے بغیر نہ رہا گیا۔

"اوہ — یہ؟ — یہ میری بیوی ہے — " لمبے ایجنٹ نے حسبِ معمول اطمینان سے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

الویرا گردوپیش کی ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھتی ہوئی جارہی تھی۔ جیسے ان سارے مناظر، ان سارے چہروں کا عکس ذہن میں محفوظ کرلینا چاہتی ہو۔ شارمین نے اسے مخاطب کیا۔ مگر وہ ایک دوکان کے سامنے ٹھٹک کر ونڈو شاپنگ میں محو تھی۔

"ارے بھئی اب آگے بڑھو چکو۔ تم تو قدم قدم پر اس طرح چپک جاتی ہو جیسے یہ چیزیں کبھی دوبارہ دیکھو گی نہیں۔" شارمین نے جھنجھلا کر کہا۔

"کیا معلوم۔ یہاں پھر کبھی نہ آنا ہو۔" الویرا نے بے خیالی سے جواب دیا اور دوکان کے شیشے سے ناک چپکائے اندر رکھی ہوئی سینڈلز کو تکتی رہی۔

"تم نے ایجنٹ کی بات سنی؟" شارمین نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے چونک کر جواب دیا۔ "خوب! — بہت خوب یہاں "کزن" نہیں کہا جاتا۔ سیدھی سیدھی بات کرتے ہیں۔ اہلِ مصر کی یہ راستگوئی قابلِ تعریف ہے۔" پھر وہ دوکان کے شیشے سے ہٹ گئی۔

"اسپیڈ کو نہ" ڈاکٹر رائے چودھری قریب آکر پائپ منہ سے نکالتے ہوئے مختصراً بولے۔ "ہمیشہ اسپیڈ ہی کہنا چاہیے۔"

اب سورج ڈھل رہا تھا۔ اہرام کے چاروں طرف حدِ نظر تک خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ متوسط طبقے کے شہری سائیکلوں، اسکوٹروں اور موٹروں پر لد کر ہوا خوری کے لیے آئے ہوئے تھے۔ چیختے چلاتے جگمگاتے مغرور شہر کے کنارے پر سارے اہرام صبر کے ساتھ چپ چاپ کھڑے تھے۔

اور شہر کی اونچی اونچی جدید عمارتوں کے بعد یک لخت چھوٹے چھوٹے کھلونے ایسے معلوم ہو رہے تھے۔ یہ بیچاری غمناک تکونی عمارتیں سیاحوں کا لایا ہوا غیر ملکی زرِ مبادلہ متحدہ عرب جمہوریہ کے خزانے میں بھرنے کے علاوہ قاہرہ کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے مقبول ترین "رانے دے وو" کا فرض بھی انجام دیتی تھیں۔ ان کے علاوہ ان گنت ٹیڈی بوائز اور ٹیڈی گرلز تنگ موری کے پتلون پہنے اور برجی باردو کی طرح کے بال رکھائے اہرام کی ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے اس کی چوٹی کی طرف جا رہے تھے۔ یا اوپر سے اتر رہے تھے۔

"میں آپ کو اندر جانے کی رائے نہ دوں گا۔ اندر بے حد گھٹن ہے اور اوپر تک چڑھنا بڑی ہمت کا کام ہے۔"

"واہ ہم تو ضرور جائیں گے۔" شارمین نے کہا۔

جیو تسانز تیم۔

اہرام کے دروازے پر ایک خشمناک طویل القامت عبا پوش گائیڈ نے انہیں آلیا۔ "گڈ ایوننگ میڈیم۔ اِی جپٹ لائیک انڈیا وری اولڈ کنٹری۔ وری این شنٹ سوی لائیزیشن۔

کم اَن اِن میڈیم۔ کم اَن اِن۔"

مسز بک ڈانلڈ اور دونوں امریکن خواتین بے حد اشتیاق سے گائیڈ کے قریب آگئیں۔ اندر نیم تاریک ڈیوڑھیوں میں ایک ہجوم غفیر موجود تھا۔ غلام گردش میں کچھ دور جا کر شارمین نے گھبرا کے کہا "میرا تو دم گھٹ جائے گا۔ تنگ جگہوں میں لگتا ہے جیسے مر رہی ہوں۔ میں تو مرنا نہیں چاہتی —— لاحول ولا قوۃ ——" اور وہ الٹے پاؤں باہر بھاگ گئی۔ "ٹھہرو ہم بھی آتے ہیں۔" اوریرا نے کہا مگر ہجوم نے پیچھے سے دھکا دے کر اسے آگے بڑھا دیا۔ اس نے بادل نخواستہ زینہ چڑھنا شروع کیا۔ پتلی پتلی آہنی سیڑھیاں جو ایک سرنگ کی طرح اہرام کی چوٹی کی طرف جاتی تھیں ان کے دونوں جانب لوہے کی ریلنگ تھی۔ نیچے سنگلاخ فرشوں اور چکنی سرمئی سنگلاخ دیواروں والے منزل در منزل اور درجہ در درجہ تاریک اور نیم تاریک کمرے تھے اور تینوں طرف سے دیواریں اس طرح جھکی آ رہی تھیں۔ جیسے ابھی دم گھونٹ دیں گی۔ دیواروں میں برقی روشنی کے بلب لگے تھے ان ننھے موکھوں میں سے ہوا کی ذرا سی رمق اندر آ جاتی تھی۔ چاروں ہاتھوں پیروں پر جھکے، تاکہ سر چھت سے نہ ٹکرائے، رگ ہانپتے کانپتے اوپر چڑھ رہے تھے مگر زینہ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔

آگے اور پیچھے ایک خلقت بھیڑ دھان اوپر جانے کے لیے کوشاں تھی یا نیچے اتر رہی تھی۔ اوریرا اگر جنگلے سے ذرا کی ذرا ٹھک کر سانس لینے کی کوشش کرتی تو ریلا اسے دھکا دے کر پھر آگے بڑھا دیتا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ایک شدید وحشت ناک خواب دیکھ رہی ہے جس طرح کا خواب اس نے سوتے میں اکثر دیکھا تھا کہ ایک اندھا کنواں ہے جس میں گرتی جا رہی ہے یا قبر میں زندہ دفن کر دی گئی ہے۔

آدھی چڑھائی چڑھ کر اسے بے حد کمزوری محسوس ہوئی اور اس کی ہمت بالکل ٹوٹ گئی۔ اس نے واپس جانا چاہا لیکن انگریز مشنری خواتین جو بڑے جوش و خروش سے اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھیں۔ اس سے کہتی رہیں —— بڑھی چلو۔ جب اتنی دور آ گئیں تو اب واپس جانا کیسا۔ غالباً یہی ان لوگوں کا فلسفۂ حیات ہے جس کے سہارے یہ زندہ ہیں۔ جب اتنی دور آ گئیں تو واپس جانا کیسا۔ اوریرا نے پھر افتاں و خیزاں اوپر چڑھنا شروع کر دیا۔

بالآخر وہ اوپر تنگ نہ چیمبر تک پہنچ گئی۔ لیڈی ڈاکٹر دلہن اور دونوں انجنیئر مع گائیڈ سمیت وہاں پہلے سے پہنچ چکے تھے۔ اس سنگی سرمئی دیواروں والے چھوٹے سے کمرے میں جو بڑے سے صندوق کی طرح چاروں طرف سے بند تھا۔ ایک طرف کو پتھر کا خالی تابوت رکھا تھا کمرے میں ناقابلِ برداشت حبس تھا۔ گائیڈ نے اپنی داستان شروع کی مگر اوریرا حد سے زیادہ دہشت زدہ ہو کر الٹے پاؤں واپس بھاگی۔

دیوار اور سیڑھی کے درمیان جو پتلی سی جگہ تھی اس کے کونوں کھدروں میں نوجوان مصری جوڑے اس اطمینان سے ایک دوسرے سے چپٹے کھڑے تھے گویا یہ لرزہ خیز دم گھونٹنے والا اہرام نہیں تھا لندن اندر گراؤنڈ کی برقی سیڑھیاں تھیں۔ افتاں و خیزاں غلام گردش میں تک پہنچ کر اوریرا باہر نکلی۔

باہر دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ نیلا آسمان۔ پرندے۔ ہرے بھرے درخت۔ ہوا۔ تازہ ہوا۔ خداوندا۔ ہوا کتنی بڑی نعمت ہے۔

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔" اس نے منڈیر پر کھڑے ہوئے ڈاکٹر رائے چودھری کا بازو پکڑ کر غصے سے کہنا شروع کیا "کہ میں پانچ ہزار برس کی تاریکی اور دہشت اور گہرائی اور بُعد اور تنہائی کا سفر طے کر کے آ رہی ہوں۔ اور اہرام مصر انتہائی عظیم الشان فراڈ ہیں۔"

"مگر کیا انجنیئرنگ کا کمال ہے صاحب۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔"

دوسری طرف مسٹر موہن سنگھ چھڑی ٹیکے دوستوں کے مجمع سے مخاطب تھے۔ "جیسے ہمارے یہاں کے ستوپ۔ میں جب ۱۹۵۳ء میں!"

دھوپ مدھم پڑتی جارہی تھی۔ شارمین اور اور دن وحتی مجمع میں غائب تھیں۔ ڈاکٹر راتھے چودھری پائپ سلگا کر خاموشی سے سامنے دیکھ رہے تھے۔ وہ ٹیلا اتر کر سڑک پر آئی جس کی دوسری جانب گلرنگ آسمان کے مقابل میں یک لخت ابوالہول نظر آگیا۔ وہ شفق کی روشنی میں اور زیادہ پُر اسرار اور پرسکون اور عجیب معلوم ہو رہا تھا اس کی شکستہ مسکراہٹ میں نرمی تھی اور دردمندی۔ اور چنے کیا۔ ہزاروں برس سے وہ دنیا کا اسی طرح نظارہ کر رہا تھا۔ یا تھی۔ ویسٹ لینڈ کے ٹائی ریسیس کی مانند۔

I, TIRESIAS,

PERCEIVED THE SCENE AND FORETOLD

THE REST.

I TOO AWAITED THE EXPECTED GUEST.

AND I TIRESIAS HAVE FORESUFFERED ALL

آس پاس چھوٹے اہراموں کے چاروں طرف شہر کے اعلیٰ طبقے کے لڑکے اور لڑکیاں شہسواری کے لیے آئے ہوئے تھے۔

رفتہ رفتہ سورج ابوالہول کے پیچھے ریت میں ڈوب گیا۔ اس کے پنجوں کے درمیان لالے کے پھولوں کے ڈھیر پر چھوٹی سی کلوپیٹرا لیٹی ہوئی ہے۔ چاندنی رات۔

اور پھر جنوب کی سمت سے ایک انسان دبے پاؤں آیا اور اسفنکس کے بائیں جانب کھڑا ہو گیا۔

"لبیک اسفنکس۔ جولیس سیزر کا سلام قبول کر۔

اس دنیا میں پیدا ہونے کی وجہ سے جن دنیاؤں سے مجھے جلاوطن ہونا پڑا ان کی، اور ایسے انسانوں کی تلاش میں، جیسا میں خود ہوں — میں ملکوں ملکوں گھوما ہوں۔ مجھے ریوڑ اور چراگاہیں، آدمی اور شہر دکھلائی دیے، لیکن کوئی دوسرا سیزر نہ ملا۔ کوئی انسان اپنا جیسا دیکھا جو دن کو میرے کارنامے انجام دیتا اور رات کو میرے جیسے خواب دیکھتا۔ سامنے کی چھوٹی سی دنیا میں اے اسفنکس میرا مرتبہ اتنا ہی بلند ہے جتنا تیرا اس صحرا میں ہے نقطہ میں مارا مارا پھرتا ہوں۔ تو ایک جگہ بیٹھی ہے میں فتح کرتا ہوں تو برداشت کرتی ہے میں عمل کرتا ہوں اور متحیر رہتا ہوں۔ تو دیکھتی ہے اور منتظر ہے۔ میں اوپر نگاہ اٹھاتا ہوں اور میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ نیچے نظر کرتا ہوں اور اندھیرے میں ڈوب جاتا ہوں۔ چاروں طرف دیکھتا ہوں اور ششدر رہتا ہوں جب کہ تو مسلسل سامنے کی طرف ٹکٹکی باندھے بیٹھی ہے دنیا سے باہر۔ کھوئی ہوئی دنیاؤں کی طرف۔ اس گہوارے کی سمت جہاں سے نکل کر ہم بھٹک گئے۔ اسفنکس۔ تم اور میں نسلِ انسانی کے لیے اجنبی ہیں لیکن ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں۔ کیا مجھے ساری عمر تمہارے وجود کا احساس نہیں رہا؟ روما ایک دیوانے کا خواب ہے۔ یہ۔ میری حقیقت یہ ہے۔ یہ ستاروں کے ایسے تمہارے چراغ میں نے گال میں، برطانیہ میں، ہسپانیہ میں، تھسلی میں، ہر جگہ دیکھے ہیں۔ یہ چراغ جو تحت الثریٰ میں چھپے ہوئے کسی ابدی نگہبان کو اہم رازوں سے باخبر کر رہے ہیں۔ اس ابدی نگہبان کا مقام میں کبھی نہ پا سکا۔ وہ بالآخر یہاں موجود ہے۔ میری زندگی کے مستقل اور زندۂ جاوید حصے کا پرتو۔ خاموش، سوچتا ہوں، نقرئی صحرا میں تنہا۔ اسفنکس۔ اسفنکس۔ میرا یہاں آنا قسمت میں لکھا تھا۔ کیونکہ میں وہ ہوں جس کی جبینیں کی تو علامت ہے۔ جو بیک وقت، جوان بھی ہے، عورت بھی، اور خدا بھی۔ کیا میں نے تیری پہیلی بوجھ لی ہے اور اسفنکس؟"

"بڑے میاں!"

"دیوتاؤ۔!!"

"بھاگو نہیں بڑے میاں!"

"بڑے میاں؟ میں جولیس سیزر ہوں۔"

"بڑے میاں!"

"اسفنکس۔! تم اپنی صدیوں کی عمر چھپاتی ہو۔ میں تم سے کہیں چھوٹا ہوں۔ گو تمہاری آواز لڑکیوں کی ایسی ہے:"

"جلدی سے اوپر آجاؤ — ورنہ رومن تمہیں کھا جائیں گے۔"

"تم کون ہو؟"

"کلیو۔"

"ہیلو۔" کسی نے پیچھے سے آکر بڑی بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا وہ چونک کر پلٹی۔

"اوہ — مادموزیل — مجھے معاف کر دیجیے۔" ایک دلکش سنجیدہ چہرے اور سوچتی ہوئی آنکھوں والا مصری نوجوان بے حد گھبرا کر کہہ رہا تھا۔ "میں — میں آپ کو اپنی ایک شناسا خاتون سمجھا۔ لللہ — براہ کرم میری اس

غلط فہمی کو دور کر دیجیے۔"

"کوئی بات نہیں۔" الویرا نے بڑے اخلاق سے جواب دیا۔ "لیکن میں ڈر ضرور گئی۔" اس بے چارے کی ندامت کم کرنے کے لیے اس نے گفت گو جاری رکھی۔ کیونکہ وہ اپنی اس "بدتمیزی" کی وجہ سے بری طرح گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ "میں سمجھی کہ توت عنخ آمون کی روح نے مجھے آ دبوچا۔ کیونکہ ابھی ابھی اہرام سے باہر نکل کر میں نے موصوف کی شان میں بہت گستاخی کی تھی۔ اور پتہ نہیں وہ توت عنخ آمون تھے یا کوئی اور۔"

وہ آہستہ سے مسکرایا۔ "ماضی میں سب کے نام ایک سے ہو جاتے ہیں۔ ہے نا۔" اس نے پوچھا، اور بڑی عجیب بات تھی کہ اس کے لہجے میں کسی پرانے دوست کی سی اپنائیت تھی۔ دنیا کے سارے اجنبی مخلص دوست ہیں۔ محض اگر ہم انہیں جان سکتے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ "جی ہاں۔" اس نے باآواز بلند جواب دیا۔ "مثال کے طور پر نفرتی تی ہی کو لیجیے۔"

وہ پھر مسکرایا۔ گویا الویرا کا مطلب سمجھتا ہو۔

"اور جب انسان مرجاتا ہے تو وہ اور آج سے پانچ ہزار سال قبل مرے ہوئے لوگ ایک ہو جاتے ہیں۔ ہم جب زندہ ہوتے ہیں محض اس وقت تک ہی نئے اور مختلف اور جدید رہتے ہیں۔ بہت خوفناک خیال ہے یہ۔" الویرا نے ملول آواز میں اظہارِ خیال کیا۔

اس شخص نے اپنا تعارف کرانے کی اجازت چاہی۔ یوسف مراد۔ جنے کیا۔ قاہرہ کی ایک یونیورسٹی میں پولٹیکل سائنس پڑھاتا ہے۔ اس کے بعد اگلے چند منٹوں تک انہوں نے پنڈت نہرو، جمال عبدالناصر اور تازہ ترین بین الاقوامی صورتِ حال پر تبادلہ خیالات کیا۔ شاید وہ قبطی عیسائی تھا۔ اور بہت انٹلکچوئیل قسم کا اور جوشیلا عرب نیشنلسٹ معلوم ہوتا تھا۔

"غالباً آپ کے ساتھی آپ کے متلاشی ہیں مادموزیل۔" سڑک کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے الویرا سے کہا۔ اور دن دھتی اور شارمین دور سے ان کی طرف آ رہی تھیں۔

"جی ہاں۔ ہم لوگ انگلستان تک اکٹھے سفر کر رہے ہیں یہ دونوں نوجوان خواتین میرے ساتھ اوکسفرڈ میں پڑھتی تھیں۔ ان میں سے ایک اب لندن میں رہتی ہیں اور دوسری اپنے شوہر کے ساتھ جنوبی امریکہ میں مقیم ہیں۔"

"جنوبی امریکہ۔ وہ تو بہت دور ہے۔"

"جی ہاں۔ بہت ہی دور ہے واقعی۔ یا مسز رائے چودھری جارج ٹاؤن میں رہتی ہیں۔ برٹش گیانا۔"

"اور۔ آپ۔ مادموزیل۔؟"

بھلا وہ اس بے چارے کو کیا بتلاتی کہ وہ اپنی موت کی طرف گامزن ہے۔ اس کے کسی ہم سفر کو اس لرزہ خیز حقیقت کا علم نہیں۔ خداوندا۔ کیا دنیا میں کوئی چیز انسانی زندگی سے زیادہ مہمل ہے؟ کیا یہ خلیق سنجیدہ مصری پروفیسر سوچ سکتا ہے کہ اس وقت وہ جس خوش شکل، نوجوان، متبسم لڑکی سے باتیں کر رہا ہے وہ خون کے ایک تقریباً لا علاج مرض میں مبتلا ہے اور جانتی ہے کہ شاید سال بھر کے اندر ختم ہو جائے گی؟ اور گو یہ صحیح ہے کہ زندگی اور موت دونوں مہمل ہیں مگر وہ جب تک زندہ ہے زندہ انسانوں کی طرح ہنستے کھیلتے زندگی گزارے گی اور آخری سانس تک اپنی قسمت سے نبرد آزما رہے گی۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا "میں امریکہ جا رہی ہوں۔"

"آپ اب وہاں پڑھتی ہیں؟"

"جی۔ جی ہاں۔"

"کس جگہ؟"

اس نے ایک لمحہ سوچ کر جواب دیا۔ "بوسٹن۔"

ہسپتال جس میں وہ داخل ہونے جا رہی تھی بوسٹن میں تھا۔ وہ ہسپتال جس میں سے غالباً وہ زندہ باہر نہیں نکلے گی۔

"میں ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔" شارمین اور دن دھتی ٹہلتی ہوئی قریب آ گئیں۔ ڈاکٹر رائے چودھری سر جھکائے پائپ پیتے اور روتی کی انگلی پکڑے دوسری طرف سے آ رہے تھے۔

تعارف کا سلسلہ ختم ہوا تو مصری نوجوان نے بڑے خلوص سے کہا۔ "مادام۔ مے موزیل۔ دکتور۔ آپ سب میرے مکان پر چلیے اور رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیے۔ میری بیوی آپ سب سے مل کر بہت خوش ہوگی۔ وہ بھی ہندوستان کی بے حد مداح ہے۔"

الویرا نے کچھ بے معنی فقرے دہرا کر معذرت چاہی کہ رات کا کھانا انہیں شارمین کے ایک عزیز کے یہاں کھانا ہے جو یہاں سفارت خانے میں تعینات ہیں کہ جب وہ پھر کبھی قاہرہ سے گزری تو ان دونوں سے ملنا

ہرگز نہ بھوسے گی — کہ کبھی انہیں بھی کھلتے آنا چاہیے۔ کیا اس کا دل ڈوب رہا تھا؟ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا — اس نے پھر پیری سی بی مسز مک ڈانلڈ کے زنانہ رومانی رسالے میں اسی قسم کی صورت حال تو تفصیل سے بیان کی جاتی ہے — جب اسے اس بات کا خیال آیا تو اس کا دل چاہا کہ زور سے چیخے۔ اس کا سانس اب تک تہ و بالا تھا جسے وہ بڑی مشکل سے چھپائے ہوئے تھی۔ غالباً اسے اہرام پر ہرگز نہ چڑھنا چاہیے تھا۔ مگر۔ وہ زندہ انسانوں کی طرح زندگی گزار رہی ہے — اور اس کے علاوہ۔ فرق کیا پڑتا ہے۔ اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے دوستوں کے گروہ کو دیکھا اور ایک عجیب کمینے قسم کے احساس برتری نے اسے بے حد مسرور کیا۔ اسے ان سب لوگوں پہ فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ بیچارے نہیں جانتے کہ ان کی زندگیوں میں آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ مگر وہ جانتی ہے۔ صرف اسے اپنے مستقبل کا علم ہے۔ شارمین کی آواز پر وہ چونکی۔ جو مصری نوجوان سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ پھر انہوں نے اسے خدا حافظ کہا۔ ڈاکٹر یوسف مراد۔ جتنے کیا — جتنے کیا — عربی ناموں کا تلفظ کس قدر ڈرامنگ بڑنگ ہوتا ہے — ماہ کنعاں — چاہ بابل — اور کیا تھا — ؟ صبر ایوبؑ کیا گریہ یعقوب کیا — اور اس کے بعد۔ عشق کی مجبوریاں پوچھے زلیخا سے کوئی — مصر کے بازار میں یوسفؑ کا سودا کر دیا۔

خدا حافظ ڈاکٹر مراد۔

BON VOYAGE مادموزیل۔

شارمین کے چچا زاد بھائی ذوالفقار کے گھر جاتے ہوئے راستے میں انہوں نے جامع محمد علی کی منڈیر سے شہر کا نظارہ کیا۔ پھیلا ہوا خوبصورت عظیم شہر۔ مغربی افق پر ابھی ہلکی سی سرخی باقی تھی۔ الازہر کی عمارت۔ قبطی کلیساؤں کے برج۔ "نیو کائیرو" کے محلات۔ سنسان، باجبروت، دلآویز۔ مسجد کے حسین ایوانوں کے اندر بیش قیمت قالین بچھے تھے۔ بڑے بڑے جھاڑ فانوسوں میں سے نکلتی ہوئی روشنی محرابوں اور دریچوں کی نازک جالیوں میں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ مسجد کے احاطے میں سیاحوں کے لیے آمون رع اور ربۃ اسیس کی مورتیاں بک رہی تھیں۔ اذان کی آواز بلند ہوئی اور قاہرہ کے آسمان کے نیچے شفق رنگ۔ بسیط فضا میں دیر تک لرزاں رہی جس طرح شفاف گلابی پانی میں بلوریں سنگ ریزہ پھینکنے سے لہروں کا دائرہ دور تک پھیلتا چلا جائے۔

افطار کا وقت ہو چکا تھا۔ "آج روزہ رکھا ہوتا تو کتنا مزہ آتا۔" شارمین نے الویرا سے کہا۔ دونوں سارے سے سر ڈھانپے، ننگے پاؤں اسلامی جوش کے مارے صحن میں سب سے آگے آگے چلی جا رہی تھیں۔

"میرے ملک کی مسجدیں اس سے کہیں زیادہ شاندار ہیں۔" پیچھے سے آتی ہوئی اورون دھتی کسی یوروپین ٹورسٹ سے کہہ رہی تھی۔

"ان بنگالیوں کی شاونزم نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔" شارمین نے چپکے سے اظہارِ خیال کیا۔

"لیکن ہمارے پاکستان کی مسجدوں کے مقابلے کی انڈیا میں ایک بھی مسجد نہیں۔" انجنیئر نے اورون دھتی کی بات کاٹی۔ اورون دھتی جب آگے بڑھ گئی تو انجنیئر نے یوروپین سے کہا۔ "یو سی — انڈیا از اے ہندو کنٹری — اگر آپ کو مسلم کلچر کی اصل شان و شوکت دیکھنا ہو تو میرے وطن آئیے۔"

ضرور۔ ضرور۔ یوروپین نے سٹ پٹا کر جواب دیا۔

ذوالفقار کے زینے پر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ ان کے یہاں شام کی دعوت کا انتظام ہو رہا ہے۔ حمیدہ باہر آئی اور ایک چیخ مار کر الویرا سے لپٹ گئی۔

"ہمارا ارادہ تھا کہ تمہارے کے یہاں بیٹھ کر ذرا سستائیں گے مگر۔ مگر یہاں بھی ہنگامہ بپا ہے۔" الویرا نے کہا۔

"ہمیں آئے دن یا ڈنر دینا پڑتا ہے یا ڈنر کھانا پڑتا ہے — اسی کام کی تنخواہ ملتی ہے۔ اتنی اسنوب نہ بنو۔ ڈاکٹر صاحب آپ کیا پئیں گے؟" حمیدہ نے اپنی سفارتی مسکراہٹ سوئچ آن کرتے ہوئے ڈاکٹر راے چودھری کی طرف مڑ کر دریافت کیا۔

"کیا خوفناک زندگی ہے تمہاری۔" الویرا نے صوفے پر گر کر اظہارِ خیال کیا۔

کچھ دیر بعد مہمان آنے شروع ہو گئے۔ کھانا شروع ہوا۔

"گیارہ بجے۔" پلیٹ اٹھاتے ہوئے شارمین نے بڑی معروف سوسائٹی لیڈر کی سی شکل بنا کر حمیدہ سے کہا۔ "ہمیں شیپرڈز پہنچنا ہے۔" ذوالفقار۔ لڑکیوں کی طرف آیا۔

"کس واسطے کہ اس وقت تمہیں لمبا ایجنٹ ملے گا۔ شیپرڈ ہوٹل کی لاؤنج میں اس سے ہمارا اپوائنٹمنٹ ہے۔" الویرا نے بھی بڑے پُراسرار

انداز میں کہا۔

"ہم لوگ ایک نہایت بیہودہ نائٹ کلب جا رہے ہیں۔ اوردن دھتی نے بڑی خوشی سے اطلاع دی۔

"کیا چیلا پن ہے۔" ذوالفقار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "رات کو ہمیں آرام سے سو دو۔ صبح سویرے تمہیں سوئیز پہنچا دیں گے اور اگر جہاز چھوٹ گیا تو اور بھی اچھا ہے پورٹ سعید سے سوار کرا دیں گے۔"

اتنے میں منقش سلائیڈنگ ڈور کا پٹ ایک طرف کو کھسکا اور — سلمان — اندر داخل ہوا۔

ارے — اوریرا متحیر رہ گئی — مضطرب — متحیر — خوفزدہ۔

اب کیا ہوگا — اب کیا۔

کچھ نہیں ہوگا — اصل زندگی مہمل ہے۔ لایعنی۔ اور کس طرح وقت ضائع ہوتا ہے — اور ہوتا رہے گا — اگر تم زندہ بھی رہ گئیں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اوریرا۔ شارمین۔ اوردن دھتی۔ دیکھو کون آیا ہے۔" حمیدہ نے اناؤنس کیا۔

دونوں کے سامنے باری باری جھکا۔ تھوڑا سا تھیڑیکل تھوڑا سا شورمس۔

"ان کو پہچانے —؟ یہ جیوتسنا مرحوم کی دوست ہیں۔" حمیدہ نے اس سے کہا۔

"آداب۔"

اس سے کیا کہا جائے، اس سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ساری زندگی مہمل ہے۔

"بے چاری جیوتسنا کے متعلق سن کر مجھے بے حد صدمہ ہوا۔" اس نے قریب کے ایک صوفے پر ٹک کر اوریرا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے گہری آواز میں کہا۔

"جی ہاں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا کہہ سکتی تھی؟ بہت ممکن ہے اگلے سال یہی — اسی صوفے پر شخص کے اسی طرح کے ایک دوست کے دوست سے یہی دوہرا رہا ہو۔ "بے چاری اوریرا کے متعلق سن کر مجھے بے حد صدمہ ہوا۔"

دو چار ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میز کی طرف چلا گیا۔

واپسی میں وہ ذوالفقار اور ڈاکٹر راؤ چودھری کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھا اور راستے بھر تینوں آدمی آپس میں باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے رہے۔ کبھی کبھی شارمین اور حمیدہ بھی گفتگو میں شامل ہو جاتیں۔ اوریرا سے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ گویا اس کی موجودگی سے بے خبر ہو۔

وہ یورپ سے لوٹتے ہوئے دو دن کے لیے نائیل ہلٹن میں ٹھہرا تھا اور صبح سویرے ہی دہلی واپس جا رہا تھا۔ ہوٹل پر اتر کر اس نے سب کو سرسری سا خدا حافظ کہا اور کوٹ کندھوں پر جھلاتا سیڑھیاں چڑھ کر اندر چلا گیا۔

لیکن نہیں خواہاں کوئی یاں جنسِ گراں کار

سڑک کے دونوں طرف ہرے رنگ کی کوچ شیپرڈز کے سامنے ان کی منتظر کھڑی تھی۔ پارٹی کے سارے افراد کھانا ختم کر کے ہوٹل سے برآمد ہوئے۔ سب سے آخر میں سرخ بالوں والی عورت اپنی جگہ پر آن کر بیٹھی۔ اور اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ وہ خوب اچھی طرح نشے میں تھی۔

"یار مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔" اوریرا نے چپکے سے کہا۔

"تمہارا وہ کالج کے زمانے والا بزدلا پن نہیں گیا۔" شارمین نے غصے سے کہا حالانکہ وہ خود بھی کافی نروس معلوم ہوتی تھی۔ "ایک نشے میں دھت قاہرہ کی طوائف کے ہمراہ آدھی رات کے وقت سفر۔ کس قدر ایڈونچرس بات ہے۔" اس نے مزید کہا۔

کوچ نیل پر پہنچی۔

میری پرنانی کی پرنانی سیاہ بلی تھی۔ سفید مقدس بلی کی بچی — اور دریائے نیل نے اسے اپنی ساتویں بیوی بنایا۔ اسی لیے میرے بالوں میں اتنی لہریں ہیں۔ اور اسی لیے میں من مانی کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ میری رگوں میں نیل کا پانی دوڑ رہا ہے۔

دریا پر سے گزرتے ہوئے اگلی سیٹ پر نیم دراز سرخ بالوں والی عورت کے بال ہوا میں اڑنے لگے اور اس نے ان کی مصنوعی لہروں پر ہاتھ پھیرا۔

"اب ہم الف لیلیٰ جا رہے ہیں۔" ملبے ایجنٹ نے مائیکروفون اٹھا کر اناؤنس کیا۔

"آہا — سمیعہ گمال —؟" اوبیرائنے مری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں سمیعہ گمال —" مونچھوں والے اسسٹنٹ نے مڑکر اسی بشاشت سے جواب دیا۔

ریڈیو پر "چاچاچا" شروع ہو گیا۔

سلومی — جہاں وہ ناچی — رقص میں بیلے رہی — یحییٰؑ رہے ہے، موسیٰؑ رہے ہے — میں بلاک جادو گے سامری — عزیز مصر۔ نحاس پاشا۔ خدیو۔ ڈوریا شفیق — پراسرار۔ عبد الوہاب — سراب — سراب — سراب۔

عہد نامہ جدید۔ مسیحؑ ناصری جناب مریم کی گود میں ٹھنسے ، گدھے پر سوار ہیروڈ کے ظلم سے بچنے کے لیے مصر بھاگے چلے آتے ہیں۔ بیت لحم کا ستارہ۔ ظلم سے بچنے کے لیے لوگ ہیں کہ مستقل اِدھر سے اُدھر بھاگے پھر رہے ہیں۔ اور ملکوں اور شہروں کی سرحدوں کی دیواریں ہیں کہ اونچی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ یوگی اینڈ دی کومیسار — یروشلم اور برلین — فلسطین سے مصر، مصر سے اسرائیل۔ اسرائیل سے جورڈن — مصر کے بازار میں یوسفؑ کا پڑا کھ دیا۔

شارمین اور دن دھتی سے کہہ رہی تھی — یہ سلیمان جو ہے تمہارا، یہ کس قیامت کا دلکس آدمی ہے — واہ — واہ — طبیعت خوش ہو گئی۔"

دل نہیں آیا قیامت آگئی — ایک کافر یہ — ایک کافر یہ — ہائی نیم جانکی بائی الہ آباد۔

میرا دل — میرے دل کا دوزخ جس کے ساتوں طبق ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر آتشیں ہیں لیکن کوئی دانتے کبھی آکر ان کی سیر نہ کرے گا۔ آرزوئیں — آدرش کمینگیاں۔ خداوندا۔ خداوند تعالیٰ جو بد قسمتوں کو کہیں نہیں ملتا اور صوفیوں کے لیے ہر شے کی انتہا ہے اور ہر شے میں ہے میرا خدا جو میرا گڈ ریا ہے جو مجھے خاموش پانیوں کے کنارے کنارے لے جاتا ہے جو مجھے گھاس پر آرام کراتا ہے — اور گو میں موت کے سائے کی وادی میں چلتا ہوں — خدایا — مجھ پر رحم کر۔ خداوندا میں تیرے اسرار سمجھنے سے انکار کرتی ہوں۔ میں تیرے قہر اور تیرے جلال اور تیرے غضب کے آگے ایک ذلیل کتیا کی طرح خاک میں لوٹ رہی ہوں آندھی کے پتے کی طرح لرزاں ہوں۔ سزائے موت کے اس قیدی کی طرح جو جلاد کی دستک کا منتظر بیٹھا ہو خداوندا میں تیرے سامنے حاضر ہوں۔

میرا دل — جو کالی کا مندر ہے — جس میں خلقت اٹا ٹوٹ گھسی ہوئی ہے جس کے تنگ صحن میں چلاتے ہوئے بکری کے بچوں کا سر کلہاڑی سے جدا کیا جا رہا ہے۔ کالی کی تین سرخ آنکھیں سامنے دیکھ رہی ہیں جدھر جہنم ہے۔ کالی کی مورتی سولہ سو سال سے زمین میں آدھی دفن ہے۔ ماں۔ اس کے مندر کے فرش پر کتوں کے پلّے لوٹتے پھر رہے ہیں عورتیں بکروں کا سرخ سرخ گوشت کاٹ رہی ہیں ماں۔ ماں۔

میرا دل سوناگاچی کی تاریک گلی ہے۔ جس میں میری آرزوئیں، میری پشیمانیاں، میری حیرتیں پاوڈر سے لپی پتی سستی ساڑیوں میں لپٹی کونوں کھدروں میں، غلیظ دیواروں سے لگی کھڑی ہیں اور آنے والوں کو تک رہی ہیں — ہر آرزو یہ سوچتی ہے کہ اب کا آنے والا مکتی لائے گا اس گلی سے نکال لے جائے گا۔

میرا دل سوناگاچی کی وہ سرخ ساری والی خوبصورت معصوم کمسن لڑکی ہے جو اپنے دروازے کے اندر چپ چاپ بیٹھی رہا کرتی ہے جس کے سامنے موٹر رکتی ہے مگر دو منٹ ٹھہر کر آگے بڑھ جاتی ہے۔

اب سارے دروازے مقفل ہیں۔

گلی تو چاروں اور بند ہوئی — میں ہری ملن کیسے جاؤں۔

"ہم نے بھی کیا کیا ایڈونچر کیے ہیں۔" شارمین مسٹر سنگھ کو بتلا رہی تھی۔ "ایک مرتبہ ہم لوگ کلکتے میں سوناگاچی دیکھنے گئے — اوفوہ — کس قدر لرزہ خیز۔"

اس لمحے سے میری عقوبتوں میں اضافہ ہو گا۔ میرا ان دیکھا عقوبت رساں مجھے مرتے دم تک کوڑے مارتا رہے گا۔ خداوندا — تو جو رحیم و کریم ہے تو نے مجھے اس لیے پیدا کیا کہ میں اس طرح زندہ رہوں۔ اور اس طرح مروں — ؟ میری زندگی میں او خدائے ذوالجلال تو جانتا ہے کہ بیشتر وقت ایسے آئے ہیں جب میں نے کہا ہے کہ یہ میری زندگی کا بدترین، مشکل ترین، خوفناک ترین لمحہ ہے — مگر آج کی رات — اس سے زیادہ حادر کیا ہو سکتا تھا؟

اور گو میں موت کے سایوں کی وادی میں چلتی ہوں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ میرا پیالہ لبریز ہے۔ میرا خدا میرے دشمنوں کے سامنے میرا سر جھکاتا ہے۔

خوبصورت زرد فراک میں ملبوس زلیخا بائی ماچس والا پچھلی سیٹ پر بیٹھی ٹام ڈولی آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔

HANG DOWN YOUR HEAD TOM DOOLEY

HANG DOWN YOUR HEAD AND CRY
HANG DOWN YOUR HEAD TOM DOOLEY
POOR BOY YOU'RE BOUND TO DIE

"الف لیلےٰ" کی ننھی سی اسٹیج کے تین طرف نیم تاریکی میں کرسیاں اور میزیں بچھی تھیں۔ اسٹیج پر آرکسٹرا والے بہت مغموم شکلیں بنائے بیٹھے تھے۔ رقص شروع ہو چکا تھا۔ ایک دبلی پتلی رقاصہ "بیلی ڈانس" کے باریک ہلکے میں نیم ملبوس اپنی ٹانگیں ہوا میں اچھالنے میں مصروف تھی۔ لڑکیوں نے اسٹیج کے کنارے ایک میز کے گرد بیٹھتے ہوئے بڑے اسٹائل سے قہوہ منگوایا گویا ان کی ساری عمر اسی طرح "بیلی ڈانس" دیکھتے اور قاہرہ کے نائٹ کلبوں میں راتیں گزارتے بسر ہوئی ہے ان کا یہ بچوں کا سا اکسائیٹ منٹ دیکھ کر ڈاکٹر راسے چودھری بزرگانہ شفقت سے مسکراتے رہے۔ ایک کے بعد ایک بہت ساری رقاصاؤں نے آن کر اپنے "فن" کا مظاہرہ کیا۔ ان سب کے پیٹ سفید جالی سے ڈھکے ہوئے تھے۔ یہ سفید جالی اچھا خاصا یونیفارم معلوم ہو رہی تھی۔

"لیکن یہ لوگ اپنے پیٹ نہیں ہلا رہی ہیں۔" شارمین نے مایوسی سے کہا۔ "بیلی ڈانس میں پیٹ ہی تو ہلاتے ہیں نا۔"؟

"ہم سنا ہے جب سے پریذیڈنٹ ناصر حکم دیئے ہیں کی ان لوگ اپنا بدن کو یہ کریں۔ مئنے اپنا بدن پہلے جتنا کمتی چھپاتا تھا اب جیاستی چھپائیں۔ اس لیے نہیں سکتیں۔" اوروندھتی نے بڑی سنجیدگی سے بنگالی اردو میں جواب دیا۔

"کیا نہیں سکتیں۔" شارمین نے دریافت کیا۔

"پیٹ نہیں ہلانے سکتیں۔" اوروندھتی نے جواب دیا۔

"بے چاریوں کو سخت فرسٹریشن ہوتا ہوگا۔ کہ پیٹ ہی نہیں ہلا سکتیں۔" الویرا نے کہا۔

"رمضان کے مہینے میں یہ بیہودگیاں۔ لاحول ولاقوۃ۔" شارمین نے غصے سے کہا۔ "اور مشرق وسطیٰ کو اسلام کا گہوارہ سمجھا جاتا ہے۔ میں تم سے سچ کہتی ہوں اسلام کہیں اپنی اصلی حالت میں زندہ ہے تو برصغیر میں۔ کیا تم سوچ سکتی ہو کہ کوئی ہندوستانی یا پاکستانی رقاصہ اس طرح ناچے گی؟" اس نے خطیبانہ انداز میں الویرا سے سوال کیا۔

"تالیاں۔" الویرا نے کہا۔

"ہونہہ۔ لاحول ولاقوۃ۔" شارمین نے غصے سے پہلو بدلا۔

جب میں یہاں ۱۹۵۱ء میں آیا تھا۔ تب یہ بیلی ڈانسر لوگ ایک دم شفاف اور مختصر ترین لباس پہنتی تھیں۔ کیا زمانے تھے وہ بھی۔" مسٹر موہن سنگھ آہ بھر کر برابر کی میز پر کسی سے مخاطب تھے۔

اتنے میں قریب کی دوسری میز پر کھڑبڑ ہوئی اور چاروں مشنری خواتین اس رقص کی تاب نہ لا کر خفگی سے اٹھ کھڑی ہوئیں اور کرسیوں کے درمیان سے گزرتی پاوڈر روم کی طرف چلی گئیں۔ وہ شام انہوں نے پاوڈر روم میں بیٹھ کر انجیل مقدس پڑھنے میں گزاری۔

اس کے بعد دو لڑکیاں اور آئیں جن میں سے ایک چارلس اول کی ہم شکل تھی۔ دوسری شکل سے بے حد معصوم، ذہین اور حساس معلوم ہوتی تھی۔

"کسی اچھے خاندان کی لڑکی معلوم ہوتی ہے بے چاری۔" الویرا نے بے دھیانی سے اظہار خیال کیا۔

"خالص مڈل کلاس ردِ عمل۔ کیا دقیانوسی جہالت کی باتیں کرتی ہو۔ اچھا خاندان۔ بُرا خاندان۔ یہ سب سرمایہ دارانہ نظام کی برکتیں ہیں بی بی۔ جہاں اس قدر دھڑلے سے عورت کی تجارت کی جاتی ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ماسکو میں نائٹ لائف ہوتی ہی نہیں سرے سے؟" شارمین نے کاندھا ہوا میں ہرا کر جواب دیا۔ شارمین ان لوگوں میں سے تھی جنہیں لفٹ ونگ انٹیلکچوئیل کہا جاتا ہے۔

"نسوانی اناٹومی کے اس مسلسل مظاہرے سے" مسز مک ڈانلڈ نے برابر کی ایک کرسی سے جھک کر کہا۔ "طبیعت خراب ہو گئی۔"

"جب ہی تو میں کہتا ہوں مائی ڈیر کہ تم لوگوں کو ایسی جگہوں پر نہیں آنا چاہیے۔ تم ہماری تفریح میں بھی خلل انداز ہوتی ہو۔" مسٹر مک ڈانلڈ نے جواب دیا اور پھنسی ہوئی آواز میں خود ہی ہنسے۔

ایک گداز سی پختہ عمر عورت نے "آکرٗ یا مصطفےٰ۔ یا مصطفےٰ" گانا شروع کیا۔ اور ساری رقاصائیں اسٹیج پر لوٹ آئیں اور اس کے ساتھ اس مقبول گیت میں شامل ہو گئیں۔

اب رات کے دو بج رہے تھے۔ تینوں لڑکیاں باہر نکلنے سے پہلے پاوڈر روم میں گئیں تو انہوں نے مشنری خواتین کو صوفوں پر بے خبر سوتے پایا۔ ادھیڑ عمروں کی بدشکل، بے ڈھنگ خواتین جو عینکیں لگاتی

تھیں اور تازہ ترین فیشنوں اور عطریات کے استعمال سے بے نیاز تھیں اور مسیح ناصری کی انجیل کا پیغام لے کر ملایا کے جنگلوں اور ہندوستان اور پاکستان کے دور افتادہ علاقوں میں گئی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک "تیس" سال سے مرزاپور میں رہتی تھی۔ ایک نے عمرِ عزیز کے پچیس سال سیالکوٹ کے ایک گرد آلود قصبے میں گزار دیے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگیوں میں کیا کھویا تھا۔ کیا پایا تھا۔؟ یہ بھی عورتیں تھیں اور وہ چالیس سالہ خرانٹ گلیمرس مغنیہ جو سیاہ جالی کا چمک دار گاؤن پہنے اسٹیج پر "یا مصطفےٰ۔ یا مصطفےٰ" گا رہی تھی۔ وہ بھی عورت تھی۔ اس نے کیا کھویا تھا۔؟ کیا پایا تھا۔؟

"مس گورڈن۔ اٹھیے۔" الویرا نے صوفے کے قریب جا کر غیر شعوری طور پر اپنی پرانی "اسکول گرل آواز" میں احترام اور دردمندی سے کہا۔ "اٹھیے۔ ہم لوگ واپس چل رہے ہیں۔"

وہ چاروں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ مس گورڈن نے آنکھیں چندھی کر کے چاروں طرف گلابی اور نقرئی ساٹن کی دیواروں والے پاؤڈر روم پر نظر ڈالی اور انہیں یاد آ گیا کہ وہ کہاں ہیں۔ عینک ناک پر جمانے سے پہلے آنکھیں ملتے ہوئے ایسا لگا جیسے وہ اپنے آپ سے کہہ رہی ہوں۔ میں یہاں کیا کر رہی ہوں۔؟

وہ سب باہر نکل آئے۔ رات خنک تھی۔ اندر رقص اسی طرح جاری تھا۔ یہ جمال عبدالناصر کے حسین دارالسلطنت کا سب سے بڑا نائٹ کلب تھا اور مشرقِ وسطیٰ اور بحیرہ روم کے ساحلوں کی حسین ترین رقاصائیں یہاں ناچتی تھیں۔ پارٹی کے سارے افراد تھکے ہارے سڑک پر آ کر کوچ میں سوار ہوئے۔ سرخ بالوں والی عورت پہلے سے آن بیٹھی تھی۔ اتنی دیر بعد اسے دیکھ کر بڑی عجیب سی یگانگت محسوس ہوئی۔ گویا وہ پرانی دوست ہو۔ ان نیم عریاں رقاصاؤں کے مقابلے میں تو وہ اچھی خاصی مولون معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے دروازہ زور سے بند کر کے الویرا کو دیکھا اور قہقہہ لگایا۔

الویرا سہم گئی۔ کوچ روانہ ہوئی۔

اب سڑکیں خاموش تھیں۔ بازار سنسان ہو چکے تھے۔ جدید قاہرہ۔ پرانا شہر۔ غریبوں کے محلے۔ کوچ نے بڑی سلاست سے آبادی چھوڑ کر صحرا کا رخ کیا۔ صبح کا تین بج رہا تھا۔ سوئز اسی میل دور تھا۔ لوگ سونے کے خیال سے سیٹوں پر نیم دراز ہو گئے۔ سناٹا چھا گیا۔ لمبا ایجنٹ ڈرائیور کے نزدیک نشست پر بیٹھ گیا۔ سرخ بالوں والی عورت آگے کو جھک گئی اور اس کے منہ کے قریب منہ لے جا کر آہستہ آہستہ کچھ کہنے لگی۔ وہ غالباً بہت تفصیل سے اسے کچھ بتا رہی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے تک اسی طرح جھکی وہ لمبے ایجنٹ سے سرگوشی میں مصروف رہی۔ اس کے بعد سیٹ سے ٹک کر بیٹھ گئی۔

پھر یک لخت اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ وہ دیر تک اسی طرح روتی رہی۔ لمبا ایجنٹ اور مونچھوں والا اسسٹنٹ اطمینان سے بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ پھر اس نے بھی ایک سگریٹ جلایا اور آنسو پونچھے اور سر پیچھے ڈال کر آنکھیں بند کر لیں۔

سب لوگ سو چکے تھے۔ کوچ صحرا کے عمیق سناٹے میں بے آواز خیال کی طرح گزر رہی تھی۔ چاروں طرف وسعت اور تاریکی اور ریت کے ذرّے تھے۔ کول تار کی سیدھی سڑک پر سے گزرتی ہوئی روشن کوچ کے اندر مختلف قومیتوں اور رنگوں اور مذہبوں کے مختلف دنیاؤں سے آئے ہوئے اور مختلف دنیاؤں کی سمت جانے والے "تیس" مرد اور عورتیں کمبلوں میں لپٹے آنکھیں بند کیے یا سو رہے تھے یا غنودگی کے عالم میں جہاز پر واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اور صبح کا اور بریکفاسٹ کے سریلے باجے کا۔ اور روشن سمندر اور اپنے ہم سفروں اور عزیزوں کے مانوس چہروں کا، جو دوبارہ ان کا احاطہ کریں گے۔ وہ سب اس وقت سے کچھ پہلے کھو گئے تھے اجنبی شہر، آسیب زدہ صحرا اور رات اور تکان اور نیم خوابی کا یہ سحر بہت مختصر تھا۔ ابھی یہ ٹوٹ جائے گا۔

سحر ٹوٹ گیا۔ سوئیز کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ دور سے اپنا جہاز دکھلائی دیا جسے دیکھ کر ایسی خوشی ہوئی گویا وہ اپنا گھر تھا۔ نیچے اتر کر وہ اپنے پاسپورٹ چیک کرانے کے لیے چیک پوسٹ کی طرف بڑھے۔ کوچ خالی ہو گئی۔ سرخ بالوں والی عورت سب سے پہلے اتر کر ایک طرف کو کھڑی ہو گئی تھی۔

کسی نے اس کو خدا حافظ نہیں کہا۔ اس نے کسی کو خدا حافظ نہیں کہا۔

وہ کسی کو دیکھ کر مسکرائی بھی نہیں۔ الویرا اپنا بیگ سنبھال کر جیٹی کی طرف جانے لگی تو اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر فرنچ میں کہا۔ "مادموزیل۔ آپ نے ایک پیکٹ گرا دیا۔"

"شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔" الویرا نے پیکٹ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے گھبرا کر کہا۔

جواباً اس نے سر ذرا سا خم کیا۔ گویا وہ مصر کی ملکہ تھی۔ مقدس دیبا

کی بیٹی۔ جس کی رگوں میں نیل کا پانی دوڑ رہا تھا۔ مصر کی پُر اسرار راتوں کی اداس روتی ہوئی آنکھوں والی ملکہ۔ جو اپنے شاہی وقار اور تمکنت کے ساتھ باہر کی دنیا سے آئی ہوئی ایک اجنبی، حیرت زدہ، معصوم، بے وقوف سانولی لڑکی کا شکریہ قبول کرتی ہو۔

وہ انجن کے پاس اسی طرح کھڑی رہی۔ کہرے میں اس کے سگریٹ لائیٹر کی لَو ایک سیکنڈ کے لیے چمکی۔

مسافر سیڑھیاں اتر کر لانچ میں جا بیٹھے۔ وہ کوچ کے پاس کھڑی رہ گئی۔ وہ اور اس کے دونوں ساتھی۔ لمبا ایجنٹ جو ہر ہفتے صبح و شام اسی طرح جہازوں پر اکر غیر دلچسپ، دولت مند، احمق، سیانے، عقلمند، قنوطی، بے تکے، بھانت بھانت کے سیاحوں کو ایک ہی انداز، ایک ہی الفاظ، ایک ہی تعارف کے ساتھ اپنے شہر کی سیر کراتا ہے۔ جس کی خوبصورت اور کمسن محبوبہ شہر میں ایک عالی مقام طوائف ہے جسے وہ مذاقاً بیوی کہتا ہے۔ مونچھوں والا اسسٹنٹ، سرخ بالوں والی عورت۔ وہ تینوں اسّی میل کا صحرائی فاصلہ طے کر کے قاہرہ واپس جائیں گے۔ کس قسم کے گھر، کس قسم کی صبحیں، کس قسم کی زندگیاں ان کی منتظر ہوں گی۔

کیونکہ اب پو پھٹ رہی تھی۔ سمندری ہوا بہت سرد تھی۔ جہازوں اور کشتیوں کی روشنیاں مدھم پڑ گئی تھیں۔ رڈکیوں کا جہاز دور کھلے سمندر میں ایک باوقار، مضبوط، مہیب چٹان کی مانند کھڑا تھا۔ اس پر لہراتے ہوئے یونین جیک نے اوریا کو یقین دلانا چاہا کہ دنیا میں ابھی پائیداری باقی ہے۔ سویز کے باوجود۔

...Library
Sadarganj ... -800

سو بچایا - پانچ سو پایا
یہ منافع کہاں سے آیا؟

مسلم کمرشل بینک کی انوسٹمنٹ سرٹیفکیٹ اسکیم

ایم سی بی انوسٹمنٹ سرٹیفکیٹ اسکیم آپ کی بچت پر بہترین منافع کا واحد ذریعہ ہے، اس اسکیم میں آپکے بچائے ہوئے سو روپئے ساڑھے چودہ سال سے بھی کم مدت میں پانچ سو روپیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ گویا آپ کی بچت پر ۳۰ فیصد منافع ملتا ہے۔ اسی طرح دس سالہ پلان میں ۳۲٫۲۱ فیصد اور پانچ سالہ پلان میں ۳۹٫۱۵ فیصد منافع ملتا ہے۔ آپ اس اسکیم میں سو سو روپے کے حساب سے ایک سال یا اس سے زیادہ مدت کے لئے جتنی رقم چاہیں جمع کرا سکتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت آپ بینک کی قرض کی سہولت سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

MCB
خدمت میں پیش پیش
مسلم کمرشل بینک

MCB-47-75-UD

Ravi-Delmon Ltd.

بک کلب

ہمیں معلوم ہے کہ آپ علم و ادب کے شائق ہیں اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اچھی کتابوں کا حصول مہنگائی کے سبب ایک عام قاری کے لئے قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے۔

ہم اس مسئلے کا حل پیش کرتے ہیں:

انتخاب پبلی کیشنز نے اعلیٰ ادب اور دنیا بھر کی عظیم علمی و ادبی کتابیں حیران کن حد تک سستی قیمت پر شائع کرنے کا انقلابی منصوبہ بنایا ہے۔ اس منصوبے کے تحت ہماری کوئی کتاب چار روپے سے زائد قیمت کی نہیں ہو گی۔ چار روپے میں بھی ہم آپ کو وہ کتاب پیش کریں گے جو بازار میں پندرہ اور بیس روپے تک فروخت ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ بعض کتابیں ہم آپ کو دو روپے اور چار روپے کی درمیانی قیمتوں پر بھی پیش کریں گے۔ اگر آپ چاہیں تو یہ کتابیں آپ کو گھر بیٹھے باقاعدگی کے ساتھ ملتی رہیں گی ——

تجویز یہ ہے۔

- آپ ہمیں علی الحساب -/۴۰ روپے (چالیس روپے) بذریعہ منی آرڈر / بنک ڈرافٹ بھیج دیجئے (زائد پر پابندی نہیں) کتابیں آپ کو مہیا ہونی شروع ہو جائیں گی۔
- ان چالیس روپوں کا ہم باقاعدہ حساب رکھیں گے اور رقم ختم ہونے پر آپ کو باقاعدہ اطلاع دی جائے گی۔
- ہر کتاب آپ کو رجسٹری کے ذریعے بھیجی جائے گی۔ ڈاک خرچ ہمارے ذمے ہو گا۔
- جب آپ بارہ کتابیں حاصل کر چکیں گے تو تیرھویں کتاب ہماری طرف سے آپ کے لئے تحفہ ہو گی۔

ممبر شپ کے لئے آج ہی پہلی فرصت میں ہمارے بک کلب کے ممبر بنئے۔

ہماری پہلی کتاب اردو ادب کا عظیم ناول "امراؤ جان ادا" مصوّر ایڈیشن ہے اور اس کی قیمت صرف چار روپے ہے۔ ترسیل زر اور خط و کتابت کے لئے:

انتخاب بک کلب

انتخاب پبلی کیشنز

مسلم ٹاؤن لاہور

ہماری اگلی کتاب ——

اس مصنف کی کتاب

- جس کی ہر نئی تخلیق اُردو ادب کے ایوانوں میں تہلکہ خیز ثابت ہوئی۔
- جس کی ہر کتاب نے مقبولیت کے نئے معیار قائم کیے۔
- جس کا نام اور قلم کتاب کے معیار کی ضمانت ہے۔
- جو عوام اور خواص میں یکساں مقبول ہے۔
- جس نے اُردو ادب کو سوچ، فکر اور معیار کی نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔

لبیک ——

اور —— ایلی اور الکھ نگری کے مصنف

ممتاز مفتی

کی کتاب

"علی پور کا ایلی" —— کا انتخاب

(یہ انتخاب ممتاز مفتی نے خود کیا ہے)

ایلی کے عشق

(دو جلدوں میں)

پہلی جلد —— اپریل ۱۹۷۶ء —— دوسری جلد —— مئی ۱۹۷۶ء

اپنے شہر کے ہاکر، ایجنٹ یا بک سیلر کے ہاں آج ہی اپنی کاپیاں بک کروائیں —— یا براہ راست ہمیں لکھیں۔